ہفت روزہ

الفتح

کراچی

۱۴ اگست ۱۹۷۲ء

قیمت ——— ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے ——— ۵۵ پیسے

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد۔ ۳ شمارہ۔ ۱۳

۱۰ر۔ ۱۷ر اگست ۱۹۷۲ء

نگران

شوکت صدیقی



مدیر

ارشاد راؤ



نائب مدیر

وہاب صدیقی

سرورق : اقبال عشرتی

بدل اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	سہ ماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے:	۵۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت :۔ ۶۰ فلس دوبئی، قطر: ۵۰ درم
سعودی عرب :۔ ۵ قرش۔ انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت

ہفت روزہ "الفتح" ۱۰۔ ۷۔ ڈی نرسری کمرشل ایریا
پی ای۔ سی ایچ۔ ایس ۔۔ کراچی۔ ۲۹

ایڈیٹر پبلشر : ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد۔ کراچی

ٹیلیفون : ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

صحافی۔ حکومت اور مالکان

انگریزی اخبار "سن" پر پابندی کے اثرات ملازمین کی علامتی بھوک ہڑتال کی صورت میں رُونما ہو رہے ہیں۔ حکومت کی جانب سے ڈیکلریشن کی منسوخی کے بعد سن کی انتظامیہ نے ملازمین کی برطرفی کے نوٹس جاری کر دیئے ہیں جس کے نتیجے میں دو سو کے لگ بھگ کارکنوں کو بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کارکنوں کو معاشی بحران سے نکالنے کے لئے صحافیوں کی تنظیم پی۔ ایف۔ یو۔ جے نے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں اور مقدور بھر کوششوں سے کام لے رہی ہے کہ ان کارکنوں کا معاشی تحفظ کیا جا سکے۔ انجمن کے سیکرٹری جنرل جناب منہاج برنا کا یہ بیان کہ ۱۵ر اگست تک "سن" کا ڈیکلریشن بحال نہ ہوا تو وہ تادمِ مرگ بھوک ہڑتال کر دیں گے۔ پی۔ ایف۔ یو۔ جے کی قیادت کی "سن" کے ملازمین کے مستقبل کے بارے میں گہری تشویش کا مظہر ہے۔

یہ بات تسلیم کہ اخبارات پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ یہ بھی مانا کہ سرمایہ داروں کے اخبارات پاکستان پیپلز پارٹی کے دُشمن ہیں۔ اُن کا بس چلے تو وہ اس جماعت کو منٹوں سیکنڈوں میں اقتدار سے محرُوم کر دیں۔ یہ بھی دُرست ہے کہ ان اخبارات نے بدترین صحافت کے شاہکار پیش کئے ہیں۔ عوام دشمنی کا ارتکاب کیا اپنے کارکنوں کو اداروں سے اس لئے نکال دیا کہ وہ بائیں بازو کی سوچ کے مالک ہیں۔ اس کا شکار جناب منہاج برنا بھی ہوئے اور "سن" کی انتظامیہ نے تو چُن چُن کر بائیں بازو کے کارکنوں کو اپنی سرمایہ دارانہ ہوس کا نشانہ بنایا۔

لیکن حکومت کو نقصان پہنچانے کے لئے جہاں سرمایہ دار سرگرم عمل ہیں وہاں اُس کی غلط پالیسیوں کا بھی دخل ہے۔ "سن" پر پابندی لگانے سے یقیناً سرمایہ داروں کا کچھ نہیں بگڑا، اُن کے پاس جنگ اور ڈان ہے۔ اُن کی پالیسیاں کون سی عوام کے مفاد میں ہیں جو سن کی نہ تھیں۔ حکومت نے ایک اجتماعی فیصلہ کرنے کی بجائے نیم دلانہ کارروائی کی۔ اس کا نقصان اُن لوگوں کو پہنچا جنہوں نے یحیٰی آمریت کے خلاف عوامی جدوجہد کی حمایت کی تھی۔ اس وقت انہیں پی پی آئی کے معظم علی نے مجرم گردانا تھا اور آج وہ عوامی حکومت کے عتاب کا شکار ہو گئے ہیں۔

حکومت کو اخبارات کے بارے میں ابھی سے فیصلہ کر لینا چاہئے کہ یہ سرمایہ داروں کے قبضے میں رہیں گے یا اُن پر حکومت کا کنٹرول ہو گا۔ حکومت انہیں اپنی تحویل میں لے گی یا نہیں۔ سرمایہ داروں کے اخبارات کی حیثیت سے یہ اُن کا پیدائشی حق ہے کہ وہ اپنی بات منوائیں۔ حکومت یہ برداشت نہیں کر سکتی تو وہ کارکنوں کے معاشی مستقبل کا تحفظ کرے۔ سن کے بند ہونے سے دوسو افراد بیروزگار ہوئے۔ جنگ کے بند ہونے سے دو ہزار افراد متاثر ہوں گے۔ ڈان پر پابندی تقریباً اتنے ہی ملازمین کی معاشی ابتری کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔

ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ حکومت عامل صحافیوں کے معاشی قتل عام سے مکمل گریز کرے۔ سرمایہ داروں کے اخبارات سے عامل صحافیوں کا تعلق صرف اتنا ہے جتنا کہ کسی مل میں کام کرنے والے ورکر کا اپنے سیٹھ سے ہوتا ہے۔ یہ بات حکومت کو ذہن نشین کرنا ہو گی ورنہ حالات دوسرا رُخ بھی اختیار کر سکتے ہیں جو افسوسناک ہو گا۔ سرمایہ دار دراصل یہی چاہتا ہے کہ وہ حکومت اور کارکنوں کو آپس میں لڑا دے۔ ہمارے خیال میں سرمایہ دار اپنی اس چال میں کامیاب ہو رہا ہے اور وہ نوکرشاہی کے ذریعے حکومت کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ سن کے ملازمین کے معاشی مستقبل کا فوری تحفظ کیا جائے۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اخبارات کو سرکاری یا سرمایہ داروں کے کنٹرول کی بجائے کارکنوں کی تحویل میں دیدیا جائے۔ کنٹرول کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ ان میں حکومت کا ایک نمائندہ ہو جو صرف افسر رابطہ کا کام انجام دے اور اُسے اپنی رائے مسلط کرنے کا بالکل حق نہ ہو۔

جماعت اسلامی روسی حکمت عملی کے مطابق کام کرے گی

الفتح
انکشاف

پاکستان کی مارکیٹوں میں روبل کی خفیہ خرید و فروخت

چند روز پیشتر کی بات ہے۔ این یو جے کے دفتر میں نام نہاد اسلام پسند صحافی جمع تھے۔ اور موجودہ صورت حال پر دھواں دھار بحث ہو رہی تھی۔ منافرت پھیلانے میں پیش پیش ایک مقامی اردو اخبار کے جماعتی مدیر نے جھوم کر کہا۔

"پاکستان رہے یا بھاڑ میں جائے ہمیں اس کی پروا نہیں ہمارا سیاسی انتقام بھٹو کو علاقائی لیڈر بنا دے گا۔ اس حکومت کو ہم زیادہ دن چلنے نہیں دیں گے۔"

ایک نوجوان صحافی جو ابھی ابھی صحافت کے پیشے میں داخل ہوا ہے اور جماعتیوں کا حلقہ بگوش ہوا ہے، اُس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "یہ تو ٹھیک ہے، مگر یہاں یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ حکومت کی ناکامی کے بعد ملٹری جنتا کے اقتدار کی راہ تیسری بار ہموار ہو گی۔ کیا یہ صورتِ حال ہمارے لئے سودمند ثابت ہو گی۔"؟

جماعتی مدیر نے مربیانہ انداز میں جواب دیا ــــــ "ہمارا اصل مقصد بھی یہی ہے ــــــ فوجی جنتا سے ہمارا اتحاد اس اصول پر ہو گا کہ وہ اقتدار میں آنے کے بعد نئے سرے سے انتخابات کرائے۔ اس بات کا سو فی صد یقین ہے کہ اگر نئے انتخابات کرائے گئے تو جماعت اسلامی بھاری اکثریت سے کامیاب ہو جائے گی۔ اگر بھاری اکثریت، سے کامیابی حاصل نہ ہوئی تو دوسری اسلام پسند پارٹیوں کے ساتھ مل کر اقتدار پر قابض ہو جائے گی ــــــ پنجاب اور سندھ کے کچھ علاقوں میں ہماری کامیابی یقینی ہے۔ بلوچستان اور سرحد کی نیپ ہم سے تعاون کرنے پر آمادہ ہے۔ نیپ کے اپنے سیاسی مفادات ہیں اور وہ ہمارے تعاون کے بغیر حاصل نہیں کر سکتی ــــــ"

روزنامہ جسارت کے صحافی نے سوال کیا ــــــ "اگر فوجی جنتا اپنے وعدوں سے مُکر گئی تو پھر کیا ہو گا۔"؟

اسلام پسند مدیر نے ترنگ میں کہا ــــــ "کراچی کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک شروع کر دی جائے گی ــــــ اس مقصد کے لئے ہمیں آگ اور خون کے سمندر سے گزرنا پڑا تو ہمیں اس کے لئے تیار رہنا ہو گا۔ نیپ نے اپنے تعاون کا یقین دلایا ہے ــــــ کراچی کو سندھ سے علیحدہ کر کے بلوچستان میں شامل کرنے کی تحریک میں نیپ ہم سے برابر تعاون کرے گی ــــــ"

نوجوان صحافی نے سہم کر کہا: "جناب اس طرح تو ہم روس کی ایشیائی سلامتی کے خوفناک منصوبے کا حصہ بن جائیں گے ــــــ یعنی سرحد، بلوچستان اور سندھ کے سب سے متموّل علاقہ اور بندرگاہ کراچی کو ملا کر روس کے زیر اثر ایک علیحدہ ریاست تشکیل دینا۔"

جماعتی مدیر نے غرّا کر کہا کہ ــــــ "بھاڑ میں جائے پاکستان ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر روس ہمارے مفادات کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے تو ہم اُسے ہر قیمت پر خوش آمدید کہیں گے۔"

جماعت اسلامی کی بغل بچہ تنظیم این یو جے (نیشنل یونین آف جرنلسٹس) کے دفتر میں نام نہاد اسلام پسند صحافیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو من و عن یہاں نقل کر دی گئی ہے۔ اس میں ذرا برابر مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا گیا۔ قارئین اس بات چیت سے جماعت اسلامی، نیپ اور دوسری رجعت پسند پارٹیوں کے ناپاک عزائم کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کس قدر خوفناک منصوبہ تیار کیا جا چکا ہے شاید حکومت کے علم میں بھی یہ بات ہو۔ مگر حکومت کی طرف سے اس بات کی توقع کرنا کہ وہ اس منصوبے کو ناکام بنانے کے لئے فوری طور پر کوئی ٹھوس اور عملی قدم اٹھائے گی۔ محض خوش فہمی ہو گی۔ حکومت کی اپنی نااہلی اور کمزوری سے رجعت پسند پارٹیاں بھرپور فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ حکومت موثر تدارک کرنے کے بجائے پے در پے الٹی سیدھی حرکتیں کر رہی ہے۔ جس سے پاکستان کو تباہ کرنے کا منصوبہ خود بخود طاقت ور بنتا جا رہا ہے۔

این یو جے کے جماعتی صحافیوں کی گفتگو سے دو چار اہم نکات سامنے آئے۔

- جماعت اسلامی اور دوسری سیاسی پارٹیاں ملک میں فوجی آمریت کی راہ ہموار کر رہی ہیں۔
- جماعت اسلامی فوج سے اس شرط پر تعاون کرے گی کہ دوبارہ الیکشن کرائے جائیں۔
- اگر دوبارہ الیکشن نہیں کرائے گئے تو کراچی کو سندھ سے علیحدہ کر کے بلوچستان میں شامل کرنے کی تحریک چلائی جائے گی۔
- کراچی کے ایک مخصوص طبقے کے مفادات کی خاطر روس کا تعاون حاصل کیا جائے گا۔

لسانی فسادات اور اس کے بعد چند دوسرے ہنگامے اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ کراچی اور لاہور میں دائیں بازو کی سیاسی پارٹیوں کی قیادت میں نکلنے والے احتجاجی جلوسوں اور مظاہروں میں کھلے عام فوج کو سیاست میں ملوث کرنے کے نعرے بلند کئے گئے۔ جماعت اسلامی اور اس کی بغل بچہ تنظیموں کے کرتا دھرتا اپنی پرائیویٹ محفلوں میں کہتے پھر رہے ہیں: "ہمارا مقصد موجودہ پارٹی کو اقتدار سے ہٹانا ہے۔ چاہے فوجی جنتا ہی کیوں نہ آ جائے"!

لسانی فسادات کے بعد اگر اخبارات کی فائلوں کو دیکھا جائے تو ہمارا شبہ یقین میں تبدیل ہوتا نظر آئے گا کہ رجعت پسند پارٹیاں جوشِ انتقام میں عوام پر فوجی آمریت مسلط کرنا چاہتی ہیں۔ جماعت اسلامی کے بعض رہنماؤں کے علاوہ تحریکِ استقلال کے ہوائی ایئر مارشل اصغر خان اور حقہ بردار رہنما نصر اللہ خان بار بار یہ بیان دے رہے ہیں، کہ موجودہ قومی اسمبلی کی حیثیت مشکوک ہے۔ چنانچہ سرِ نو الیکشن کروائے جائیں۔ یکم اگست کے اخبارات میں اصغر خان کا بیان شائع ہوا ہے کہ صدر بھٹو مستعفی ہو جائیں اور ملک میں دوبارہ انتخابات کرائے جائیں۔"

اسی دن پاکستان جمہوری پارٹی کے رہنما نصر اللہ خان کا بھی بیان شائع ہوا، جس میں اسی قسم کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ جماعت اسلامی پہلے سے بیان داغ رہی ہے کہ موجودہ حکومت ناکام ہو گئی لہٰذا اُسے مستعفی ہو جانا چاہیئے۔ یہ ایک رنگ کے سارے بیانات ایک ہی سازش کا پتہ دے رہے ہیں کہ پیپلز پارٹی اقتدار سے ہٹ جائے۔ فوجی جنتا اقتدار سنبھال لے اور فوج کے تعاون سے ملک پر رجعت پسندوں کا اقتدار قائم ہو جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو کراچی کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک چلا کر ملک ہی کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔

باقی صفحہ ۶ پر ملاحظہ فرمائیں

"ہم روس کا خیر مقدم کریں گے" ایک ایڈیٹر کا اعلان

احوال واقعی

پاکستان بچے گا یا نہیں؟

واقعتِ حال

مشرقی پاکستان کے المیے کے بعد ہر اندرونی اور بیرونی واقعہ کو مَیں صرف اس نقطہ نظر سے دیکھتا ہُوں کہ یہ پاکستان کو برقرار رکھنے پر منتج ہوگا یا پاکستان کو ختم کرنے پر !!

اتنی بڑی قیامت گزرنے کے بعد اب زندگی میں جذباتیت کی کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔ اب ہر قدم پر حقیقت پسندی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی مخالف اندرونی اور بیرونی قوتوں کے جس سیاسی عمل نے بالآخر مشرقی پاکستان کو ہم سے الگ کیا، وہ عمل اب بھی جاری ہے۔ یہ تمام قوتیں اب بھی اتنی ہی بااثر ہیں اور پاکستان کے لوگ اب بھی اس طرح آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔ اس لیے اب ہر لمحے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ہمارا ہر قدم ہمیں کس طرف لے جا رہا ہے۔

ممکن ہے ہم میں سے اکثر شعوری طور پر پاکستان سے مخلص اور انتہائی محبِ وطن ہوں مگر جذباتی اندازِ فکر کی وجہ سے لاشعوری طور پر ہم بھی پاکستان کی تباہی میں حصہ لے رہے ہوں۔ ہمارے اعمال پاکستان کو متحد رکھنے کی بجائے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی طرف لے جا رہے ہوں اس وقت ایک لمحہ کی غفلت بھی ہمیں برسوں پیچھے لے جا سکتی ہے۔

پاکستان کو ختم کرنے کے لیے مصروفِ کار قوتیں پاکستان کے عوام کو ایسے مسائل پر اُلجھانا چاہتی ہیں۔ جو ان کے جذبات سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً مذہب، زبان، محنت کشوں کے مسائل، اس میں وہ ایک عرصہ سے کامیاب بھی ہو رہی ہیں۔ صدر بھٹو نے چودہ ملکوں کے دورے سے واپسی پر کہا تھا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ ——— "ایل۔ ایل۔ ایل" سازش تیار ہو رہی ہے خبر نہیں یہ اطلاع صدر بھٹو کو کس ذریعے سے ملی تھی لیکن افسوسناک یہ ہے کہ صدر بھٹو کی حکومت اس سازش سے باخبر ہونے کے بعد اس سازش کا تدارک نہ کر سکی بلکہ سازش کرنے

روسی سفارتخانے کی گاڑیاں

جماعتِ اسلامی والوں کے

گھروں کے آس پاس

گھوم رہی ہیں۔

والوں کو موقع دیا کہ وہ عوام کے جذبات کو بھڑکا سکیں۔ اس سے انکار نہیں کہ عوام کے جذبات کو بھڑکایا گیا لیکن عوام کو اس جال میں پھنسنے کا موقع تو حکومت دے رہی ہے۔ عوام دشمن قوتیں اتنی خبردار اور مستعد ہیں کہ کوئی لمحہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ اردو، سندھی کے مسئلے پر یہ پہلے سے احساس تھا کہ عوام کو آپس میں لڑوایا جائے گا اور سیاسی بدامنی پیدا کی جائے گی۔ پھر مطالبہ کیا جائے گا کہ صدر بھٹو مستعفی ہو جائیں۔ یہ تو سب کچھ ہوا مگر پیپلز پارٹی کی حکومت نے اس سلسلے میں کیا کیا ——— ؟ جواب بالکل نفی میں ہے۔

معاملہ صرف اردو کا نہیں تھا۔ جیسے کہ اردو کے ایک بڑے اخبار کے دو ذمہ دار ایڈیٹران ایک شراب خانے میں علی الاعلان کہہ رہے تھے ——— "ہمیں تو یہ آدمی زہر لگتا ہے ہم اس کو نیچے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہم اخبار کا پلیٹ فارم استعمال کریں گے۔" پھر انہوں نے کہا ——— "کراچی کی تقدیر اب سندھ سے وابستہ نہیں ہے کراچی، بلوچستان اور سرحد کے ساتھ جائے گا"۔ ایک صاحب نے کہا ——— "یہ تو روسیوں کی چال ہے۔" انہوں نے شراب کے نشے میں اور بلند آواز سے کہا ——— "ہاں ہم روسیوں کا خیر مقدم کریں گے"۔ یہ ایڈیٹر صاحب جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج کل جماعتِ اسلامی اور روس کی گاڑھی چھن رہی ہے۔ ولی خان اور سرحد جماعت کے امیر اکٹھے "آزادیٔ صحافت" کے جلسوں سے خطاب کرتے ہیں روسی سفارت خانے کی گاڑیاں جماعتِ اسلامی کے رہنماؤں کے گھروں کے آس پاس دکھائی دیتی ہیں۔ پیپلز پارٹی کے دونوں صوبوں میں نیپ اور جماعتِ اسلامی مل کر حالات خراب کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے رہی ہیں

اب تعلیمی اداروں میں ہنگاموں کی تیاریاں کی جا رہی ہیں

معاملہ اردو کا ہے نہ آزادیٔ صحافت کا ——— مسئلہ صرف یہ ہے کہ صدر بھٹو کی حکومت بحرانوں سے دوچار رہے پیپلز پارٹی کے شہزادے وزارتوں اور سفارتوں کے نشے میں ان چالوں کو کوئی اہمیت دینے کے موڈ میں نہیں ہیں انہوں نے طوطے کی طرح رٹ لگا رکھی ہے ——— "عوام ہمارے ساتھ ہیں" حالانکہ عوام اور ان کے درمیان فاصلے بڑھ رہے ہیں۔ عوام کے جذبات کو بھڑکایا جا رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کا ان سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔

پہلے تو عوام دشمن جماعتوں نے کوشش کی کہ اتنا بحران پیدا کیا جائے کہ مسلح افواج ملک بچانے کے لیے ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۹ء کی طرح میدان میں آ جائیں۔ جنرل ٹکا خان کو تاریں بھیجی گئیں۔ فوج نے سندھ کے بعض علاقوں میں جب سول انتظامیہ کی مدد کی تو اس کو اخبارات نے اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا تاکہ لوگوں میں فوج کے لیے محبت پیدا ہو جائے۔ پنجاب میں نعرے لگے ——— "ٹکا خان آوے ای آوے"۔ جنرل ٹکا خان سندھ کے دورے پر آئے تاکہ سرحدوں پر موجود افواج کی صورتِ حال دیکھیں اور عنقریب مقبوضہ علاقوں سے فوجوں کی واپسی شروع ہونا ہے اس کا جائزہ لیں، تو ان عوام دشمن طاقتوں نے افواہیں پھیلائیں کہ ——— ٹکا خان مہاجرین کی جلی ہوئی دکانیں دیکھ رہے ہیں، خود جائزہ لینے آئے ہیں۔ مگر جب جنرل ٹکا خان کی طرف سے کوئی حوصلہ افزا جواب نہ ملا تو انہی لوگوں کے کارندوں نے آزادیٔ صحافت کے دن نعرے لگائے ——— "بھٹو ٹکا حکومت نہیں چاہیئے"۔ ایئر مارشل اصغر خان نے کہا کہ ——— "بھٹو صاحب حکومت کو چیف جسٹس کے حوالے کر کے مستعفی ہو جائیں کیونکہ وہ ان انتخابات میں کامیاب ہوئے تھے جو ایک ایسی حکومت نے کرائے تھے جسے عدالتِ عالیہ نے غیر قانونی قرار دیا ہے۔ اصغر خان نے بھی انہی انتخابات میں حصہ لیا تھا اور شیخ مجیب الرحمٰن نے بھی انہی انتخابات میں کامیابی حاصل کی تھی جنہیں ایئر مارشل اصغر خان اور ان کے ساتھی اب بھی پورے پاکستان کی سربراہی دینا چاہتے ہیں۔

ایک طرف یہ صورتِ حال ہے، دوسری طرف حکومت کا یہی حال ہے۔ حکومت بیورو کریٹ چلا رہے ہیں، وزرائے کرام ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں اور بنگلوں میں یا کچھ لوگ تقریروں میں مصروف ہیں۔ عوام کے مسائل بڑھتے جا رہے ہیں اور آمدنی کم ہو رہی ہے مہنگائی بڑھ رہی ہے، مایوسی بڑھ رہی ہے۔ اقتصادی پریشانیاں زیادہ ہو جائیں پھر تو پڑوسی سے پڑوسی دور ہو جاتا ہے ملک میں یکجہتی کہاں رہتی ہے۔ ذمہ دار لوگ اپنے خاندانوں اور قبیلوں کے افراد کے مسائل حل کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں مجروم اکثریت اسی طرح محروم ہے۔ پیپلز پارٹی کی حکومتوں اور سرحد و بلوچستان کی حکومتوں، سب کا یہی حال ہے ملک کو متحد رکھنے اور یکجہتی پیدا کرنے کی امید پیپلز پارٹی سے تھی۔ مگر وہ اپنے اقتدار والے صوبوں میں انتشار پھیلانے میں مدد کر رہی ہے۔ سرحد اور بلوچستان سے غیر مقامی افسروں کو فوراً تبدیل کیا جا رہا ہے۔ کوئی گورنر مرکز کے ایجنٹ کے طور پر کام نہیں کر رہا ہے۔ کوئی بابائے بلوچستان بن گیا ہے، کوئی شیرِ سندھ، کوئی قائدِ پنجاب اور کوئی قائدِ سرحد ——— گورنروں کا کام سیاسی جلسوں سے خطاب یا سیاسی بیانات دینا نہیں ہوتا۔ گورنر مرکز اور بالخصوص وزیر داخلہ کا نمائندہ ہوتا ہے، گورنر سرحد اور گورنر بلوچستان اور وزیر داخلہ کی اکثر ٹھنی رہتی ہے ایسے حالات میں کیا یکجہتی اور کیا اتحاد کی امید کی جا سکتی ہے۔ ملک میں کوئی مرکزی سیاسی قوت نظر نہیں آتی ہے۔ صوبائی قوتیں ہیں یا علاقائی قوتیں۔ اس ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والی قوتیں زیادہ مضبوط اور زیادہ تیزی سے سرگرم عمل ہیں۔ منطقی اور تاریخی نتیجہ تو اسی عمل کا برآمد ہوتا ہے جو تیزی سے آ رہا ہو۔ مجھے تو کوئی مضبوط قوت پاکستان کی یکجہتی اور اتحاد کے لیے سرگرم عمل نظر نہیں آ رہی ہے قارئین کرام! آپ خود اندازہ کر لیں کہ ہمیں کس طرف لے جایا جا رہا ہے ———؟

جاتے جاتے میں ایک اور تنبیہہ بھی کر دوں کہ اب جونہی تعلیمی ادارے، کالج، سکول، یونیورسٹیاں کھلیں گی عوام دشمن قوتوں کا پروگرام ہے کہ وہاں ہنگامے کروائے جائیں۔ حکومت ماشاءاللہ پہلے کچھ نہیں کرے گی بالآخر گولی چلے گی ——— گولی کا نتیجہ پھر وہی ——— بربادی ——— انتشار ———!

بقیہ: الفتح انکشاف

رجعت پسندوں کی یہ سازش روسی حکمت عملی کا ایک حصہ ہے۔ نیپ اس حکمت عملی کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ نیپ کے جنرل سیکرٹری محمود الحق عثمانی پانچویں قومیت کا نعرہ ہائے مستانہ بلند کر کے اپنے سیاسی جال کو پھیلا رہے ہیں۔ بلوچستان کے ایک رہنما نواب اکبر خان بگٹی لندن میں قیام کے دوران اپنے ایک انٹرویو میں اسی قسم کے موقف کا اظہار کر چکے ہیں۔ سندھ کی موجودہ صورت حال سے پاکستان کو تباہ کرنے کے منصوبے کو برابر تقویت پہنچ رہی ہے۔

پاکستان ایک انتہائی نازک مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ روسی لابی تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق کراچی کے بازاروں میں کھلے عام روبلز فروخت کئے جا رہے ہیں اور ایک غیر مصدقہ اطلاع کے مطابق پاکستان کے بعض علاقوں میں ایک مخصوص سیاسی جماعت کے کارکنوں کو روسی ساخت کا اسلحہ فراہم کیا جا رہا ہے۔

جماعتِ اسلامی نے اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ عوام میں نامقبول ہے۔ وہ انتخابات کے ذریعہ اقتدار حاصل نہیں کر سکتی۔ چنانچہ وہ سازشیں کر رہی ہے۔ فوجی آمریت مسلط کرنے کی سازش ——— کراچی کو سندھ سے علیحدہ کر کے بلوچستان میں شامل کرنے کی سازش ——— ملک کو تباہ و برباد کرنے کی سازش۔ اس کے لئے وہ نیپ کے ذریعہ روسی حکمتِ عملی پر بھی کام کرنے کے لئے آمادہ ہو چکی ہے۔ اس بار نیپ اور جماعت اسلامی کا گٹھ جوڑ ایک بڑی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔ عوام کو اگر پاکستان بچانا ہے تو اس کے لئے ابھی سے تیاری شروع کر دیں۔

ظاہری خبریں، اندرونی کہانیاں



آغا شورش کاشمیری



جنرل رانی اور اس کی بیٹی فرحانہ پولیس کی تحویل میں

جنرل رانی اور شورش

ساتھ ساتھ پورے ملک کے سیاسی دورے پر جانے والے تھے

ابُوالمنصور

جنرل رانی پکڑی گئیں اور عین ہنگامۂ طرب پکڑی گئیں

انہوں نے لاہور کے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کے ایک کمرے میں بزمِ نشاط آراستہ کی جہاں شراب کا دور چلتا تھا، جام ٹکراتے تھے گھنگھرو بجتے تھے۔ رقاصہ نیل کنول رقص کرتی تھی جنرل رانی میزبانی کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ ان کی بیٹی فرحانہ رضا تماش بینوں کے دل لبھاتی تھی۔ بیٹا مستحسن رضا خاطر و مدارات کرتا تھا۔

جو ذرّہ جس جگہ تھا وہیں آفتاب تھا۔

رات گہری ہوئی اور محفل اپنے شباب پر آئی تو رقص تیز ہوا شراب نے اپنا رنگ دکھایا۔ نشہ سب کے ہوش و حواس بہالے گیا قہقہے بلند سے بلند تر ہوتے گئے۔ محفلِ نشاط کے ہنگامے سوا ہو گئے۔ برابر کے کمروں میں کچھ غیر ملکی مقیم تھے۔ اس ہنگامہ آرائی سے اُن کی نیند اُچاٹ ہو گئی۔ رات بسر کرنا مشکل ہو گئی۔ انہوں نے ہوٹل کے منتظمین سے احتجاج کیا۔ کسی نے پولیس کو ٹیلی فون کر دیا۔

پولیس آئی تو جنرل رانی ہوٹل کے بار روم میں بغیر پرمٹ غٹاغٹ شراب چڑھاتی تھیں۔ ان کی بیٹی کمرہ نمبر ۱۰۲ میں دادِ عیش دیتی تھی۔ اس وقت عجیب رنگِ محفل تھا۔ حجاب کے پردے اُٹھ چکے تھے۔ عشوہ طرازی تھی، لگاوٹ تھی۔ غمزہ و ادا تھا۔ ہاتھ بڑھتے تھے جسم مچلتے تھے، جام کھنکتے تھے، شیشے ٹوٹتے تھے لیکن پولیس نے خوش ذوقی کا مطلق ثبوت نہ دیا۔ سب کو دھر لیا۔

یہ یکم اگست کی رات کا ذکر ہے۔ لاہور میں آزادیٔ صحافت کا دن منایا جا رہا تھا۔ جمہوری پارٹی کے دفتر میں جلسۂ عام منعقد ہوا تھا۔ اُدھر آزادیٔ صحافت پر دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں۔ اُدھر رقاصہ نیل کنول کی گرفتاری پر ہیرا منڈی میں کہرام برپا تھا۔ اِس کے رشتہ داروں کو پتہ چلا تو بھاگے بھاگے شورش کاشمیری کے پاس پہنچے۔ دیرینہ روابط یاد دلائے۔ اپنی بپتا سنائی۔

شورش اِس وقت آزادیٔ صحافت کے درد میں مبتلا تھے۔ انہوں نے جنرل رانی کی گرفتاری کا حال سُنا تو یہ غم بھی غمِ دوراں سے کم نہ رہا۔ جماعت اسلامی کے جنرل سیکرٹری چودھری رحمت الٰہی قریب بیٹھے تھے۔ شورش نے ان سے رجوع کیا۔ اُن کے علم میں یہ بات آئی تو وہ بھی سخت تشویش میں مبتلا ہوئے۔ فوراً اُن کے ذہن رسا نے کام کیا۔ جھٹ جماعت کے کارکن دو مود دیتے بلائے انہیں سکھا پڑھا کر جنرل رانی کی طرف دوڑایا۔ اپنی پوری حمایت کا یقین دلایا۔ قانونی چارہ جوئی کرنے کا وعدہ کیا۔

جماعت کے کارکنوں نے کسی نہ کسی طرح جنرل رانی سے رابطہ



شورش نے نیل کنول کی رہائی کے لئے دیرینہ تعلقات کی بھی لاج نہ رکھی

پیدا کیا۔ پورا منصوبہ بتایا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ کہاں تو جنرل رانی پولیس والوں کی منّت سماجت کرتی تھیں۔ کسی نہ کسی طور معاملہ رفع دفع کرانا چاہتی تھیں۔ مودودیوں سے ملنے کے بعد انہوں نے فوراً پینترا بدلا اخبار نویس اور فوٹوگرافر پہنچے تو شور مچایا کہ "یہ سراسر ظلم ہے۔ مجھ سے سیاسی انتقام لیا جا رہا ہے۔ مجھے دھمکیاں دی گئیں کہ تم حکومت کے خلاف غلط سلط باتیں کرتی ہو۔ افواہیں پھیلاتی ہو۔ فوراً لاہور سے نکل جاؤ۔ ورنہ تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔"

جنرل یحییٰ جنرل رانی کی مدد سے "اسلامی آئین" بنا رہے تھے



صرف یہی نہیں جماعت اسلامی کی ہدایت پر جنرل رانی نے یہ بھی انکشاف کیا کہ وہ موچی دروازے پر جلسۂ عام سے خطاب کرنا چاہتی تھیں۔ وہ میدانِ سیاست میں داخل ہونے کا منصوبہ بنا رہی تھیں۔ انہیں گرفتار کر کے اس منصوبے کو ناکام بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر وہ اپنے ارادے سے پیچھے ہٹنے والی نہیں۔ وہ سیاستدان بننے کا تہیہ کر چکی ہیں۔ انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ اس عزمِ صمیم کا اظہار انہوں نے بلند آواز سے یہ شعر پڑھ کر کیا۔

اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

جنرل رانی نے فی الحال اس انکشاف سے گریز کیا کہ جماعت اسلامی کے ساتھ ان کا دیرینہ رابطہ ہے۔ اور اُس وقت سے ہے جب جماعت نے اسلامی آئین بنانے کے لئے جنرل رانی کے توسط سے یحییٰ خان کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اُن دنوں جماعت کے لیڈروں اور یحییٰ خان کے درمیان متعدد خفیہ ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں نوابزادہ شیر علی خان نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ یہ ۱۹۷۰ء کے ابتدائی مہینوں کا ذکر ہے۔ اس زمانے میں جنرل رانی بڑے لاڈ سے شیر علی خان کو "بھائی جان" کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ اور وہ اس اندازِ تخاطب پر نہایت خوشنودی کا اظہار کرتے تھے۔

جنرل رانی کی مودودی سے بھی اکثر ملاقاتیں ہوتیں۔ ان ملاقاتوں کا بندوبست شورش کاشمیری کے توسط سے ہوتا تھا۔ شورش کے مراسم جنرل رانی سے الطاف گوہر کی دشمنی کے باعث ہوئے۔ وہ الطاف گوہر کی حقیقی چچازاد بہن ہیں۔ الطاف گوہر کے والد راجہ تفضل حسین جنجوعہ مرحوم جنرل رانی کے والد راجہ غضنفر حسین کے چھوٹے بھائی تھے۔ شروع میں دونوں بھائیوں کے آپس میں بڑے اچھے تعلقات تھے۔ بلکہ ایک روایت کے مطابق جنرل رانی بچپن ہی سے الطاف گوہر سے منسوب ہو چکی تھیں۔ مگر شادی کی نوبت نہ آئی دونوں خاندانوں کے تعلقات گجرات کی ایک جائیداد کے تنازعہ پر اس قدر خراب ہو گئے کہ معاملہ عدالت تک پہنچا۔ برسوں مقدمہ بازی ہوتی۔

اس مقدمے بازی نے ناچاقی کو دشمنی میں بدل دیا۔ یہ دشمنی بڑھی تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ بڑے بھائی نے جوڑ توڑ کے ذریعے چھوٹے بھائی راجہ تفضل حسین کا ٹھیکہ منسوخ کروا دیا۔ ان کے پاس ریلوے اسٹیشنوں اور ٹرینوں پر مشروبات اور چائے فروخت کرنے کا سالہاسال سے ٹھیکہ تھا۔ شورش کاشمیری کو اس خاندانی دشمنی کا سُراغ ملا تو انہوں نے الطاف گوہر کے خلاف مواد حاصل کرنے کے لئے جنرل رانی سے رابطہ پیدا کیا۔ پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ اس رابطے نے اچھے اور خوش گوار مراسم کی شکل اختیار کر لی۔

یحییٰ خان برسرِ اقتدار آئے تو جنرل رانی کا ستارہ بھی عروج پر پر آیا۔ وہ گجرات کے ایک پولیس انسپکٹر کی بیوی سے ترقی کر کے جنرل رانی بن گئیں۔ صرف اقلیم اختر نہ رہیں۔ اب یہ حقیقت ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ جنرل رانی پوری طرح یحییٰ خاں کی شخصیت پر حاوی تھیں۔ ان کے دربار میں جنرل رانی کا طوطی بولتا تھا۔ اکثر انتظامی اور سیاسی فیصلوں میں انہیں دخل ہوتا تھا۔ جنرل رانی کا شورش کاشمیری نے یہ عروج دیکھا تو دیرینہ مراسم سے فائدہ اٹھایا۔ الطاف گوہر سے رانی پہلے ہی جلی تھیں۔ شورش نے اکسایا تو انہیں انتقام لینے کا موقع ہاتھ آیا۔ الطاف گوہر نہ صرف ۳۰۳ میں برطرف ہوئے بلکہ طرح طرح کے الزامات میں ملوث بھی ہوئے۔

شورش کاشمیری نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ جنرل رانی کے ذریعے اور بھی کتنے افسروں کو برطرف کروایا۔ قدرت اللہ شہاب کی

جماعت اسلامی اور یحییٰ کے درمیان رانی نے خفیہ معاہدہ کروایا تھا

جلاوطنی بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ جماعت اسلامی کے ساتھ شورش کاشمیری کے تعلقات کی نوعیت بھی ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ شورش جب ۱۹۶۹ء میں قید سے رہا ہوئے تو کراچی میں تھے۔ ان دنوں وہ پیپلز پارٹی کا قصیدہ پڑھتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اپنا رہنما بتاتے تھے۔ جن کی کوششوں کا ان کی رہائی میں بڑا ہاتھ تھا۔

جب تک شورش کراچی میں رہے، ہر جلسے اور ہر بیان میں پیپلز پارٹی کی تعریف اور توصیف کرتے تھے اور اس قدر کرتے تھے کہ یہ عام تصور پیدا ہوا کہ وہ پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عوام نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دھوم دھڑکے سے اُن کا جلوس نکالا۔ مگر جب وہ کراچی سے لاہور پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا تمام اخباری دھندا ٹھپ تھا۔ ۹۰ ہزار روپے کا قرضہ تھا۔ مہاجر نہ ہو کر بھی انہوں نے مہاجر بن کر لاہور کے ایک ہندو انقلابی کا جو پریس اور ہوٹل اپنے نام الاٹ کرایا تھا۔ وہ اُن کی عدم موجودگی میں بدانتظامی کا شکار ہو چکا تھا۔

بڑا اکڑا وقت تھا۔ شورش کو قرضہ ادا کرنے کے لئے رقم کی ضرورت تھی۔ انہوں نے پیپلز پارٹی سے رجوع کیا۔ وہ خود فنڈ کی میں مبتلا تھی۔ اس کے ساتھ سیٹھوں اور ساہوکاروں کے بجائے غریب، مزدور، کسان اور طالب علم تھے۔ وہ شورش کی مالی امداد کر سکی۔ جماعتِ اسلامی کو شورش کاشمیری کی مالی مشکلات کا پتہ چلا اُس نے فوراً انچھر پھینکا۔ خریدار موٹی اسامی تھی۔ اندھا کیا چاہے آنکھیں۔ شورش نے موقع غنیمت جانا۔ فوراً مودودی کے ہاتھ بیعت کی۔ حلقہ بگوشوں کے رجسٹر میں اپنا نام درج کرایا اور ۹۰ پہلی قسط کے طور پر وصول کئے۔

اس طرح جماعت اسلامی اور شورش کے درمیان سودا "چٹان" نکلا تو بہت سی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں پیپلز پارٹی پر تبرا تھا اور جماعتِ اسلامی کی قصیدہ خوانی تھی۔ جماعتِ اسلامی کی قصیدہ خوانی تھی جس کے خلاف ۱۹۶۴ء کے انتخابات میں شورش نے ایوب خان اور نواب کالاباغ کی خوشنودی کے لئے مولانا امین احسن اصلاحی کے ایسے سخت مضامین چٹان میں شائع کئے جنہوں نے مودودی کے تمام خود ساختہ تقدس کا پردہ تار تار کر دیا تھا، مودودی کا سیاسی بھرم خاک میں ملا دیا تھا۔ یہ راز گھر کے بھیدی نے طشت از بام کئے تھے۔ لیکن جنہوں نے شورش کاشمیری کے بارے میں ظہور الحسن ڈار کے ۱۹۵۲ء کے مضامین پڑھے ہیں۔ انہیں مطلق حیرت نہ ہوئی۔ شورش کا کردار گرگٹ کا کردار ہے۔ جیسا وقت دیکھا ویسا رنگ بدل لیا۔

غرضیکہ جب شورش کاشمیری کا قارورہ جماعت اسلامی سے ملا تو شورش کو جماعت کی خیر خواہی دکھانے کا موقع ہاتھ آیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے تمام وسائل اور اثر و رسوخ داؤں پر لگا دیئے۔ جنرل رانی سے اُن کی پہلے ہی بہت اچھی یاد اللہ تھی۔ انہیں کچھ اور شیشے میں اتارا۔ مودودیوں کی حکومت میں اِن سے وزارت کا وعدہ کیا۔ اِس طرح مودودی کے ساتھ جنرل رانی کی خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مودودی کے علاوہ میاں طفیل محمد کو بھی یحییٰ خان کے دربار میں رسائی کا موقع ملا۔ نوابزادہ شیر علی خان نے یحییٰ خان کو باور کرایا کہ جماعت اسلامی ان کی کوششوں سے انتخابات میں اچھی خاصی اکثریت کے ساتھ کامیاب ہو گی۔ دوسری طرف نواب مظفر علی قزلباش نے قیوم لیگ کے بارے میں کامیابی کی ضمانت دی۔

چنانچہ یحییٰ خان کے ساتھ جنرل رانی کے ذریعے جماعت اسلامی کا یہ خفیہ معاہدہ ہوا کہ صدرِ مملکت یحییٰ خان ہی رہیں گے۔ اور اُن تمام بے پناہ اختیارات کے ساتھ رہیں گے جو انہیں اس وقت حاصل تھے۔

جنرل شیر علی، یحییٰ اور جنرل رانی کے درمیان رابطے کی حیثیت رکھتے تھے



ملک کا آئین اسلامی آئین کہلائے گا جو صدارتی طرز کا ہوگا۔ جماعت اسلامی اس حکومت کو "حکومت الٰہیہ" بتائے گی۔ جس میں سربراہ مملکت کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نمائندہ کی حیثیت سے ہوگا۔ جو ہر تنقید سے بالاتر ہوگا۔ اس پر تنقید (نعوذ باللہ) خدا پر تنقید کرنے کے مترادف سمجھی جائے گی۔ جماعت اسلامی عوام کو یہی بتائے گی۔ اس حکومت میں سربراہ مملکت کی مجلس شوریٰ ہوگی۔ جو تمام ایسے علماء پر مشتمل ہوگی۔ جنہیں جماعت کی سفارش پر مقرر کیا جائے گا۔ صرف اسی مجلس کو احکام شریعت کی توجیہہ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

یحییٰ خان اپنی شراب نوشی اور دوسرے مشاغل کے باعث جماعت اسلامی سے شروع میں بہت بدکتے تھے۔ مگر جنرل رانی کے اصرار اور نواب زادہ شیر علی خان کی مسلسل سفارش پر وہ جماعت سے رابطہ قائم کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مگر محتاط پھر بھی رہے۔ مگر جب انہوں نے حکومت الٰہیہ کا یہ منصوبہ دیکھا اور جماعت اسلامی کے لیڈروں کی زبانی خلفائے بنو عباس کے بارے میں غلط او صحیح داستانیں او روائتیں سنیں تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ فوراً جماعت کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

خود میاں محمد طفیل اپنے حالیہ بیانات میں یہ انکشاف کر چکے ہیں کہ یحییٰ خان اسلامی آئین نافذ کرنے پر پوری طرح آمادہ تھے مگر پیپلز پارٹی نے اس آئین کی راہ میں روڑے اٹکا دیئے۔ لیکن سب سے بڑا روڑا اس آئین کی راہ میں انتخابات کے نتائج ثابت ہوئے جنہوں نے جماعت کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ اُسے شکست ہوئی اور عبرت ناک شکست ہوئی۔

مگر جماعت نے ہمت نہ ہاری۔ ڈھیٹ بن کر حصول اقتدار کے لئے برابر ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔ اس نے جنرل رانی کے ذریعے جماعت پر یحییٰ خان کا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔ ایک روایت کے مطابق انتخابات کے بعد یحییٰ خاں، جماعت اسلامی کا نام سنتے ہی گالیاں بکنے لگتے۔ غصے سے اُن کا چہرہ سُرخ پڑ جاتا۔ آواز بے قابو ہو جاتی۔ جماعت کی شکست کا ردِ عمل اُن پر بہت شدید ہوا تھا۔ نوابزادہ شیر علی خاں اسی ردِ عمل کے نتیجے میں برطرف کئے گئے۔ یحییٰ خان اسے سازش قرار دیتے تھے۔ اور برملا کہتے تھے کہ ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا۔ ایک بوگس سیاسی جماعت کو بڑھا چڑھا کر بہت بڑی سیاسی قوت کی حیثیت سے اُن کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ ایوب خان سے زیادہ مدت تک صدر مملکت رہنا چاہتے تھے۔ جماعت اسلامی کی شکست فاش نے اُن کا سیاسی مستقبل تاریک بنا دیا تھا۔

ان دنوں جماعت اسلامی کے لیڈر یحییٰ خاں کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے۔ مگر جب مارچ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی گئی اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے تو جنرل رانی کے اصرار پر یحییٰ خاں جماعت سے دوبارہ رابطہ قائم کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اس دفعہ خفیہ ملاقاتوں کا جو سلسلہ شروع ہوا اس کے نتیجے میں ایک بار پھر یحییٰ خان اور جماعت اسلامی کے درمیان سمجھوتہ ہوا۔ جماعت کے مشورے پر مشرقی پاکستان میں میجر جنرل راؤ فرمان علی کے ذریعے انتخابات کا ڈھونگ رچایا گیا۔ ڈاکٹر مالک گورنر مقرر ہوئے۔ جماعت اسلامی اور اس کے ہمنوا صوبائی کابینہ میں وزیر مقرر ہوئے۔ "البدر" اور "الشمس" براہ راست حکومت کی سرپرستی میں آئیں اور ان کے ہاتھوں لاکھوں بنگالیوں کا قتل عام ہوا۔

یحییٰ خان کا زوال ہوا تو جماعت اسلامی نے فوراً جنرل رانی کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ اس سلسلے میں جنرل رانی کو اکثر نجی صحبتوں میں جماعت کی بے رُخی کا شکوہ کرتے سُنا گیا۔ مگر پچھلے ماہ سے جماعت

ایس آر غوری کو بیگم رانی کی سفارش پر رپورٹر سے ایڈیٹر بنا دیا گیا

پھر جنرل رانی پر مہربان ہو گئی ہے۔ رانی نے غلط نہیں کہا کہ وہ میدان سیاست میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتی ہے۔ جماعت کے ایک منصوبے کے تحت انہیں شورش کاشمیری کے ساتھ شہر شہر جلسوں میں تقریر کرنے کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ ایک اطلاع کے مطابق وہ اسی مہم پر لاہور آئی تھیں۔ انہیں محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ مگر حسب معمول انہوں نے بے احتیاطی سے کام لیا۔ رنگ رلیاں مناتی ہوئی پکڑی گئیں۔ اس کی گرفتاری کا سب سے زیادہ صدمہ شورش کاشمیری کو ہوا۔ جماعت کا یہ منصوبہ خاک میں مل گیا۔ خاصہ بڑا سرمایہ برباد ہو گیا۔ شاید اب وہ ہوٹل انٹر کانٹی کا بل بھی ادا نہ کرے۔

اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود جنرل رانی میں بعض خوبیاں بھی ہیں اس کے طفیل بعض روائتوں کے مطابق شورش کاشمیری نے پچھلے چند برس میں خوب کمائی کی۔ ان کا بینک بیلنس ملک سے نکل کر بیرون ملک پہنچ گیا۔ جنرل رانی کی بدولت فیض حاصل کرنے والوں میں اور بھی بہت سے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی سفارش پر ایک صحافی رپورٹر سے ایڈیٹر بنے۔

یہ اپریل ۱۹۷۰ء کا ذکر ہے کہ صحافیوں نے اپنے جائز مطالبات کے حق میں ملک گیر ہڑتال کی۔ جماعت اسلامی نے شیر علی خان کے تعاون سے ہڑتال کو ناکام بنانے کے لیے ہڑتالی صحافیوں کے خلاف مورچہ لگایا۔ کراچی میں جماعت نے محمود اعظم فاروقی کو اس محاذ کا کمانڈر مقرر کیا۔ ان کے مکان واقع شمالی ناظم آباد میں مالکان اخبارات کے خفیہ جلسے ہوتے۔ ہڑتالیوں کے خلاف نت نئے منصوبے تیار ہوتے۔ ان کی صفوں میں گھسے ہوئے جماعت کے مخبر صحافی ہڑتال کے بارے میں ایک ایک تفصیل آ کر بتاتے۔

جب ہڑتال نے زور پکڑا تو ڈھاکہ سے "ڈنیک پاکستان اور "اتفاق"، کے مینجنگ ایڈیٹر مشورہ کے لیے بلائے گئے۔ وہ کراچی کے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں مقیم تھے۔ اب مالکان اخبارات کے خفیہ جلسے محمود اعظم فاروقی کے مکان کے بجائے ہوٹل کے ایک کمرے میں ہوتے۔ یہ کمرہ تمام ایسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا چنانچہ مخبری کرنے والے صحافی بھی راتوں کو چھپ کر یہاں پہنچتے ان میں ایس آر غوری بھی ہوتے۔ ان دنوں وہ "مارننگ نیوز" میں رپورٹر تھے اور اپنی اسلام پسندی اور سوشلسٹ دشمنی کے لیے مشہور تھے۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر خبریں لاتے۔ جماعت اسلامی کو بانس پر چڑھاتے اور پیپلز پارٹی کے بخیے ادھیڑتے ان کا سب سے بڑا کارنامہ وہ اسکنڈل تھا جو انہوں نے رپورتاژ کے طرز پر ٹوبہ ٹیک سنگھ کی کسان کانفرنس کے بارے میں تحریر کیا تھا۔

اس زمانے میں جنرل رانی بھی ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں مقیم تھیں۔ یہ محض اتفاق تھا یا وہ کسی خاص مشن پر آئی تھیں۔ ہم نے پہلی بار انہیں اس ہوٹل میں دیکھا۔ اس وقت تک ہڑتال کو ناکام بنایا جا چکا تھا۔ "مارننگ نیوز" کے چیف ایڈیٹر محسن علی نے بعض وجوہ کی بناء پر استعفیٰ دے دیا تھا مگر استعفیٰ ہنوز قبول نہ ہوا تھا۔ ہم "ڈنیک پاکستان" کے مینجنگ ایڈیٹر احسن احمد اشک کے کمرے سے نکل کر لفٹ کی جانب چلے۔ عین اس وقت ایک کمرے کا دروازہ کھلا ایک تنومند خاتون سولہ سنگھار کیے خوشبو میں بسی ہوئی دروازے سے باہر نکلیں۔ ان کے پیچھے پیچھے غوری سر جھکائے دونوں ہاتھوں میں بوتلوں کا پلندہ سنبھالے چلے جا

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں


الفتح



جمیل الدین عالی

’سچی انقلابی جماعت کے قیام کے بغیر عوام کے دُکھ درد دُور نہیں ہو سکتے‘

منہاج برنا



منہاج برنا



عثمان بلوچ

’پاکستان کی مینجنگ ایجنسی فیل ہو گئی‘

نعیم آروی

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بنا اور اب ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء ہے - ۲۵ سال کا طویل عرصہ گزر گیا - اس مدت میں پاکستان میں بڑی بڑی سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں - المناک واقعات جنم لیتے رہے - ظلم و جبر اور استحصال کی چکی تیزی سے چلتی رہی - عوام اپنے دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے چیختے چلاتے رہے اپنے دکھوں کا علاج مانگتے رہے مگر پاکستان کے اصل خالقوں اور معماروں کی حالتِ زار پر کسی نے توجہ نہ دی - اقتدار کی کرسی پر براجمان ہونے والا طبقہ ہمیشہ بے اعتنائی اور بے مروتی کا ثبوت دیتا رہا اور بڑی بے شرمی سے قہقہہ لگاتا رہا - اس شرمناک استحصال کا نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں ظاہر ہو چکا ہے - اس وقت بھی جو ڈرامہ پیش کیا جا رہا ہے وہ بھی ملک کی مٹھی بھر سرمایہ داروں، جاگیرداروں، فوجی آمروں اور ان کی جلالی نوکر شاہی کا اسٹیج کیا ہوا ہے - ۲۵ سال کے یہ سیاسی سماجی اور اقتصادی واقعات بہت تلخ ہیں - ان واقعات کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کے لیے ہم پاکستان کے چند ممتاز افراد کے تاثرات پیش کر رہے ہیں -

متحدہ مزدور فیڈریشن کے صدر عثمان بلوچ نے کہا -

”اس زمانے میں چھوٹا تھا، پوری طرح یاد نہیں، ایک سبز جھنڈا تھا اٹھائے اٹھائے پھرتا تھا - اس وقت مکانوں اور دکانوں پر مختلف فوٹو لگے ہوتے تھے - ان میں سے چار تصویریں اب بھی میرے ذہن میں موجود ہیں ——— غازی عبدالقیوم جن کے بارے میں کہا گیا تھا کہ انہوں نے انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف تحریک چلائی تھی ——— انہیں پھانسی دے دی گئی دوسرا فوٹو ایک پارسی کا تھا جس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ اس نے تعلیم عام کی ——— ایک فوٹو قائداعظم کا تھا، میرے والدین نے مجھے بتایا کہ یہ ایک ایسا ملک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں کوئی بھوکا نہیں رہے گا، کوئی تعلیم سے محروم نہیں رہے گا -

مجھے یہ باتیں بہت اچھی لگیں - چنانچہ گدھا گاڑی پر بیٹھ کر نعرے بامیں بہت اچھی لگیں - چنانچہ گدھا گاڑی پر بیٹھ کر نعرے لگاتا ——— ”لے کے رہیں گے پاکستان“ ——— بن کے رہے گا پاکستان“ ——— ایک مرتبہ لارنس روڈ پر سکھ لڑکوں سے زبردست دنگا فساد ہو گیا -“

عثمان بلوچ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا -

”لیاقت علی خان کے انتقال پر بہت افسوس ہوا مجھے سمجھایا گیا تھا کہ قائداعظم کے بعد یہ شخص ان کے ادھورے خواب کو پورا کرے گا - گولی مارنے کی خبر سن کر رو پڑا - کچھ دن اور بیت گئے - حالات میں تبدیلی رونما ہوئی - غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا - میں نے سوچا شاید خواجہ ناظم الدین کو شاید اس لیے برطرف کیا گیا کہ ملک سے غربت دُور نہیں

'پاکستان غریبوں کے لئے نہیں بنایا گیا' عثمان بلوچ

ہوئی، تعلیم عام نہیں ہوئی ——— اچھا ہوا۔ جس دن اسکندر مرزا کے گورنر جنرل بننے کی خبر شام کے اخبار میں پڑھی میں فلم دیکھنے پیلس سینما گیا تھا۔ ٹکٹ لینے کے باوجود فلم نہیں دیکھ سکا تھا۔ طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ اس دن یہ بات سمجھ میں آئی کہ کچھ لوگ اسی طرح چور دروازے سے اقتدار پر غلبہ حاصل کرتے رہیں گے۔ اور کچھ لوگ برطرف کیے جاتے رہیں گے۔ اس حمام میں سبھی ننگے ہیں۔ جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو خیال تھا کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سو ڈیڑھ سو کی ملازمت فوراً مل جائے گی۔ اس وقت زبردست بے روزگاری تھی۔ والد صاحب کی ملازمت ختم ہو گئی تھی ڈاکیارڈ سے نیپئر بیرکس پیدل جاتا مگر ہر جگہ مایوسی ہوتی اس دوران میں ایسے بے روزگاروں سے میری ملاقات ہوئی جو مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ذہین تھے۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ پاکستان ہمارے لیے نہیں بنا۔ پاکستان میں ان غریبوں کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی گئی جنہوں نے اسے بنانے میں اپنا خون نچھاور کر دیا ہے۔ یہ ہندو سرمایہ داروں اور مسلم سرمایہ داروں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ غربت اس زمانے سے زیادہ آج ہے۔ جس کے پاس چھوٹا سا گھر ہے۔ وہ جھگی کی طرف جا رہا ہے جس کے پاس چھوٹی سی مل ہے اس کی بڑی بڑی ملیں لگ رہی ہیں۔ یہ تصور غلط ہے کہ ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے۔ عملی زندگی میں یہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اور جب تاریخ کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ ایسا ہمیشہ ہوا ہے۔ مرض کا علاج نہیں کیا جاتا۔ چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے ہیں اس کے اسباب معلوم نہیں کیے جاتے۔"

انہوں نے کہا کہ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۲ء تک میں نے طبقاتی جدوجہد کو ابھرتے دیکھا۔ غریب اور امیر کی جنگ ظالم اور مظلوم کی معرکہ آرائی دیکھی۔ اور جب مظلوم ان بندھنوں کو توڑنے کے لیے اٹھتا ہے تو ان پر تشدد ہوتے ہوئے دیکھا۔ مشرقی پاکستان میں مسلح افواج کے ہتھیار ڈالنے کا واقعہ اور بنگلہ دیش کا قیام تاریخی طور پر کوئی نئی بات نہیں۔ ایسے واقعات مسلم تاریخ میں باربار آتے ہیں۔ عباسیہ خاندان میں ترک آئے تو ایرانیوں کا سر مونڈ کر دربار سے باہر نکال دیا گیا۔ سلطنت عثمانیہ کو ٹوٹتے دیکھا۔ اسلام یا مذہب کے نام پر جب کسی علاقہ کے عوام کا معاشی استحصال کیا جائے گا تو علیحدگی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ علیحدہ ہونے والے اگر صحیح سوچ کے حامل ہوں تو استحصال سے نجات حاصل کر لیتے ہیں ورنہ غیروں یا اپنوں ہی کے استحصال کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ اگر اب بھی ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ قومیتوں کو کچلا گیا اور لوٹ کھسوٹ کا نظام باقی رکھا گیا تو باقی ماندہ حصہ بھی پارہ پارہ ہو جائے گا۔ اسے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔

پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس کے جنرل سیکرٹری مسٹر منہاج برنا نے پاکستان کے ۲۵ سالہ سیاسی سماجی اور اقتصادی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا ——— عوام کا خیال تھا کہ اس نئی مملکت میں بنیادی تبدیلیاں ہوں گی۔ اقتصادی سماجی اور سیاسی ڈھانچہ میں عوام کی خوشحالی کے اقدامات کیے جائیں گے۔ سماجی انصاف ہوگا اور جمہوری طرزِ حکومت کو اپنایا جائے گا جیسا کہ قائدِ اعظم بار بار اپنی تقریروں اور بیانات میں ان امور پر زور دیتے تھے۔ قائدِ اعظم کی وفات کے بعد جو نقشہ سامنے آیا اس سے یہ ظاہر ہوا کہ اقتدار پر زیادہ تر جاگیرداروں، ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں اور برطانوی سامراج کی وظیفہ خوار نوکر شاہی کا قبضہ رہا۔ سب سے بڑی بدقسمتی یہ رہی کہ یہاں صحیح انقلابی تحریک تو دور کی بات رہی عام بورژوا جمہوریت کی بنیادیں بھی جڑ نہ پکڑ سکیں۔ لیاقت علی خان کے انتقال کے بعد چوہدری محمد علی اور غلام محمد کی قیادت میں نوکر شاہی نے سیاسی غلبہ حاصل کیا۔ ۱۹۵۳ء میں خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو اس طرح برطرف کیا گیا کہ یہ واقعہ پاکستان کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کا حامل بن گیا۔ کیونکہ اس کے بعد اکتوبر ۱۹۵۸ء میں نوکر شاہی اور فوج کے گٹھ جوڑ کے ذریعے بورژوا جمہوریت پر پے درپے وار کیے گئے۔ پاکستان کو سامراجی معاہدوں میں جکڑا گیا۔ مشروط اقتصادی امداد قبول کی گئی۔ قائدِ اعظم نے خارجہ پالیسی میں غیر جانبداری کی حکمت عملی پیش کی تھی اسے ترک کر دیا گیا۔ مغربی پاکستان کی چھوٹی قومیتوں پر "ون یونٹ" مسلط کیا گیا اور آخر کار جمہوری ڈھکوسلے بھی عوامی حقوق کی تحریک کو کچلنے میں ناکام ہو گئے۔ تو اکتوبر ۱۹۵۸ء میں سامراج کے اشارے پر فوجی آمریت قائم کر دی گئی۔ ایوب خان کے دور میں مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں کو لوٹ کھسوٹ کی کھلی چھوٹ دی گئی۔ سرمایہ داری نظام کو مستحکم کیا گیا۔ نام نہاد اصلاحات جس کا مقصد عوام کو فریب دینا تھا، نافذ کی گئیں۔ مغربی پاکستان میں سرمایہ کے ارتکاز اور مغربی پاکستان کی فوج کو مضبوط تر بنانے کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں قومی حقوق کی بورژوا تحریک کو فروغ ملا جس کی قیادت سامراج دوست مجیب الرحمٰن کر رہے تھے ۱۹۶۸ء میں ایوب آمریت کے خلاف عوامی تحریک اگرچہ ایوب خان مسندِ اقتدار سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئی لیکن ایوب کی جگہ دوسرا فوجی جرنیل یحییٰ خان اقتدار پر براجمان ہو گیا اس نے دوسری شکلوں میں ایوب کی حکمت عملی ہی کو روا رکھا۔

پاکستان میں ۲۵ سالہ دور کی جدوجہد سے جو بات نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہاں مختلف اسباب کی بنا پر آج تک کوئی صحیح انقلابی پارٹی جو مارکسزم اور لینن ازم کے سائنسی شعور سے مسلح ہو کر پروان چڑھ سکی۔ حزبِ اختلاف میں شمار کی جانے والی نام نہاد بائیں بازو کی جو سیاسی جماعتیں قائم رہیں مثلاً آزاد پاکستان پارٹی، سرخپوش، عوامی لیگ، نیپ اور پھر نیپ کے دونوں دھڑے، اور آخر کار پاکستان پیپلز پارٹی یہ تمام کی تمام اصل میں بورژوا یا جاگیردارانہ جماعتیں ہیں جن سے کسی انقلابی تحریک کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات جو فوجی آمریت کے سائے میں منعقد ہوئے تھے، ملک کو اتحاد، صحیح جمہوریت اور انقلاب کے راستے پر ڈالنے میں ناکام رہے۔ فوجی آمروں اور ان کے ساتھ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے چھ نکات کو معرضِ وجود میں لا کر مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کا جواز پیدا کیا جس سے شیخ مجیب کی قیادت میں مشرقی پاکستان کے سامراج دوست اور علیحدگی پسندوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ اس سے بھارتی توسیع پسندوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ مشرقی پاکستان پر چڑھائی کی گئی اور آزاد بنگلہ دیش قائم کر دیا گیا۔

برنا صاحب نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ——— کہ سامراج کی پروردہ فوج نے مشرقی پاکستان میں جس طرح ہتھیار ڈالے وہ شاید ہماری تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ ہے۔ مگر جن طاقتوں کی نمائندگی ہماری فوج کی قیادت کرتی ہے اس کا یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ ۲۰ دسمبر کے بعد پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آنے کے ساتھ ہماری تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ عوام کو بڑی امیدیں تھیں کہ پیپلز پارٹی کم از کم اپنے منشور پر عمل درآمد کرے گی۔ لیکن یہ ہماری خام خیالی تھی۔ پیپلز پارٹی جن طبقوں کی نمائندہ ہے وہ بھی استحصالی طاقتیں ہیں اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ استحصالی طاقتوں کا ایک حصہ برسرِ اقتدار ہے اور دوسرا اقتدار سے محروم۔ ان دونوں میں کشمکش جاری ہے۔ وسیع تر قومی مفادات کو سامنے رکھ



سیاسی اور معاشی بحران کی ذمہ دار سیاسی جماعتیں ہیں

ظفر رضوی

۔ ہوئے ترقی پسند عوام نے حکومت کی طرف اپنا دستِ تعاون بڑھایا تھا لیکن حکمران جماعت نے عوام کو اپنے سے دور کرنے کی جو حکمتِ عملی اختیار کی ہے وہ اب ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ یومِ ویت نام کے مظاہرین پر پولیس کا لاٹھی چارج، مزدوروں پر وحشیانہ فائرنگ اور لسانی مسئلے کو نہایت بھونڈے طریقے سے حل کرنے کی کوشش، پیپلز پارٹی کا بحیثیتِ جماعت معدوم ہونا اور اس کا وزارتوں میں ضم ہو جانا، ان تمام حالات نے مل کر پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو کی مقبولیت کو شدید نقصان پہنچایا ہے جس سے دائیں بازو کی انتہا پسند سیاسی جماعتیں فائدہ اٹھا سکی ہیں اخبارات کے ساتھ بھی نوکرشاہی انداز کا جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے اس سے بھی حکومت کی مقبولیت کو دھکا لگا ہے۔ یہ صورتِ حال کہاں جا کر ختم ہو گی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

برنا صاحب نے اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا ــــ "جب تک محنت کش عوام یعنی مزدور، کسان، طالب علم اور انقلابی دانشور کسی سچی انقلابی پارٹی کے جھنڈے تلے جمع نہیں ہوتے یا بالفاظِ دیگر ایک صحیح انقلابی جماعت ان تمام محنت کش عوام کو متحد کر کے جمہوری انقلاب کے راستے پر نہیں ڈالتی، اس ملک کے عوام کے دکھ درد دور نہیں ہو سکتے۔

پاکستان کے ممتاز شاعر اور دانشور مسٹر جمیل الدین عالی نے کہا: "ہماری ڈیڑھ نسل پاکستان کو MANAGE کرنے میں فیل ہو گئی۔ یوں سمجھ لیں کہ پاکستان کو چلانے والی مینجنگ ایجنسی فیل ہو گئی۔ کمپنی باقی ہے۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد یہاں کے طبقاتی ڈھانچے کا تجزیہ نہیں کیا گیا۔ نہ ہی حقائق کو حقائق کی نظر سے دیکھا گیا۔ بلکہ یہاں کے جو اصل حقائق تھے انہیں رومانوی طریقہ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کے سلتے میں کسان، مزدور، بیروزگار، غیر آباد مہاجر اور انتہائی درجہ کی پس ماندگی پاکستان کی REALITIES تھیں۔ ان حقائق سے چشم پوشی کی گئی۔ انہیں اس طرح نظر انداز کیا گیا جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ اس کے علاوہ مغربی پاکستان پر جاگیرداروں کا مکمل کنٹرول رہا۔ جس سے آزاد ہوئے بغیر پاکستان کی مکمل آزادی کسی طرح بھی ممکن نہ تھی۔ ان مسائل کو صحیح طریقہ سے حل کئے بغیر پاکستان کو بجن چلانا ناممکن تھا۔

پاکستان بننے کے بعد طبقاتی جدوجہد کو نظر انداز کیا گیا۔ پسے ہوئے مظلوم طبقات کو کبھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ ان کے بڑھتے ہوئے مسائل سے نگاہیں چرائی گئیں اس کے بارے میں جس نے سوال اٹھایا اسے کمیونسٹ اور دہریہ کہہ دیا گیا۔ پاکستان کے ٹھوس حقائق سے جو چشم پوشی کی گئی اس کے نتیجے میں صوبائی تعصب کا دیو اٹھ کھڑا ہوا۔ نوکرشاہی کے حد سے بڑھے ہوئے اقتدار اور سرکشی نے حالات بگاڑنے میں نمایاں کردار انجام دیا۔ پہلے یوپی کی نوکرشاہی گڑبڑ کرتی رہی۔ بعد میں اس کی جگہ پنجاب کی نوکرشاہی نے لے لی۔ ان دونوں کی باہمی چپقلش اور ٹکراؤ سے صورتِ حال زیادہ زیادہ پیچیدہ اور سنگین ہو گئی۔

مشرقی پاکستان کو سیاسی اقتدار میں کبھی شریک نہیں کیا گیا۔ وہاں کے عوام کو اپنے اعتماد میں لینے کی کبھی کوشش نہ کی گئی۔ نہ ہی سنجیدگی سے اُن کے مسائل کی طرف توجہ دی گئی۔ انتظامی امور میں بھی کوئی انقلابی اصلاحات نہیں کی گئیں بلکہ ۱۹۳۵ء کے قوانین کے تحت کام چلایا گیا۔ نوکرشاہی سے کہا جاتا رہا کہ وہ خادم بن جائیں۔ یہ دھوکہ دینے کی باتیں ہیں۔ نوکرشاہی کو تربیت جس طریقہ سے دی جاتی ہے اس میں افسر اپنے آپ کو خادم نہیں حاکم سمجھتا ہے۔ تقریر میں خادم مگر عملی طور پر حاکم ــــــ! یہ عوام کو فریب دینے کی بات ہے آزادی حاصل کرنے کے بعد اگر ان امور پر سنجیدگی سے توجہ دی جاتی اور عوامی مسائل کو سائنٹیفک طریقے سے حل کیا جاتا تو شاید آج پاکستان کی کچھ اور ہی شکل ہوتی۔

عالی جی نے کہا کہ آزادی سے ہمیں فائدہ بھی حاصل ہوا ہے۔ جہاں برائیاں ہیں وہاں کچھ اچھائیاں بھی ہیں۔ آزادی کے بعد ہر آدمی اپنے آپ کو آزاد محسوس کرتا ہے۔ یہ احساس غلامی سے ایک مختلف چیز ہے۔ آزادی کے اس احساس نے عوام کو باقی محکومیوں کے خلاف سوچنے اور جدوجہد کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ آزادی کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ عوام میں سوشلسٹ سوچ بڑے پیمانے پر پیدا ہوئی۔ اگر اگر اس سوچ سے صحیح طریقہ پر کام لیا جائے تو بڑے بڑے بت ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس سوشلسٹ اندازِ فکر کی وجہ سے پاکستان انقلاب کی پہلی منزل میں داخل ہو چکا ہے۔

انجمن صحافیان کراچی کے سینئر نائب صدر جناب ظفر رضوی نے اپنے مخصوص انداز میں کھانستے ہوئے کہا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو اقتصادی استحصال سے نجات دلانے کے لیے پاکستان بنایا گیا مگر وہ مقصد اس وجہ سے حاصل نہ ہوا کہ مسلم لیگ کی قیادت جاگیردار طبقے کے ہاتھوں میں تھی۔ اس طبقے نے عوام کو ہمیشہ اپنے جاگیردارانہ شکنجے میں جکڑے رکھا کسانوں، مزدوروں اور دوسرے مظلوم طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کا انتہائی بے شرمی اور ڈھٹائی سے استحصال کیا گیا۔ میاں افتخار الدین نے اس جاگیردارانہ سماج کی دیوار میں شگاف ڈالنے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر انہیں مسلم لیگ اور صوبائی وزارت کے عہدہ سے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا۔

۱۹۵۱ء کے بعد طالب علموں نے ترقی پسند بنیادوں پر تحریک چلائی۔ کراچی کے عوام نے طلباء کا ساتھ دیا اور وزیر تعلیم فضل الرحمٰن کو استعفیٰ دینا پڑا۔ ۱۹۵۳ء میں صنعتی علاقہ میں محنت کشوں پر فائرنگ کی گئی۔ یہ دوسری بڑی تحریک تھی۔ محنت کش عوام اور ترقی پسند طلباء نے استحصالی نظام کی کھلی کھلی دہشت گردی کے خلاف بے چینی بتدریج تحریک کی صورت میں اسی وجہ سے ڈھلی کہ عوام کے ایک بڑے حصّے نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ پاکستان اس پاکستان سے قطعی مختلف ثابت ہوا جس کی برصغیر کے مسلمانوں کو جھلکیاں دکھائی گئی تھیں۔ پاکستان کے اقتدار پر قابض ہونے والے کسی نہ کسی صورت میں استحصالی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ عوام نے جب کبھی سماجی انصاف کا مطالبہ کیا، ان کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ سامراج نے پاکستان دشمن اور عوام دشمن سیاسی پارٹیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ جب کبھی اقتصادی لوٹ کھسوٹ اور استحصال کے خلاف عوامی

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں



دس (۱۰) لاکھ فوج کے مقابلے میں صرف تین لاکھ

چین چیانگ فنگ
ترجمہ: احفاظ الرحمٰن

سیاسی ڈائرکٹر لی اور نائب ڈائرکٹر تنگ نے جو میرے ساتھ کھڑے ہوئے تھے، انہیں بتایا کہ میں ایک سب ملٹری زون کا نائب کمانڈر ہوں۔

"تو تم اب ایک کمانڈر بن گئے ہو" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا تم اس دوران اپنے گھر گئے تھے۔؟"

"میں ایک بار ۱۹۵۳ء میں گیا تھا۔"

"تمہارا پرانا گھر ننگتو میں ہے نا؟"

یقیناً ان کا حافظہ غضب کا تھا۔ اتنے سالوں کے بعد بھی انہیں یاد تھا کہ میرا پرانا گھر ننگتو میں ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔

"تمہارے گھر والے کیسے ہیں اور تمہارے کنبے میں کتنے افراد ہیں۔؟"

میں نے انہیں اپنے گھر والوں کے بارے میں تمام باتیں بتائیں کہ کس طرح وہ زرعی کواپریٹو میں شامل ہوئے اور ان کا معیارِ زندگی کس طرح بہتر ہوگیا۔

"اب تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

"چار۔"

"بہت خوب!" وہ بہت خوش نظر آرہے تھے۔ پھر انہوں نے پوچھا۔ "اب تمہاری عمر کتنی ہے۔؟"

"چالیس سے اوپر۔" میں نے کہا۔

"چالیس سے اوپر کتنے؟"

"چوالیس سال!"

انہوں نے زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اب جوانی کی عمر نہیں رہی ——!"

انہوں نے میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان پکڑتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا! تو ہم لوگ پھر کبھی ایک دوسرے سے ملیں گے۔"

ان کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط تھی۔ یقیناً ان کی صحت پہلے سے کہیں زیادہ اچھی تھی۔ انہوں نے سفید رنگ کی قمیص، خاکی رنگ کا پتلون اور چمڑے کے پرانے جوتے پہن رکھے تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح سادہ تھے اور اُن سے ملنا آسان تھا۔ میں اس پُروقار شخصیت کو کار کی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ جو ان کو لے جانے کے لئے ان کے انتظار میں تھی۔

میں اس اچانک اور خوش گوار واقعے سے اتنا متاثر ہوا کہ ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ میں جاگتا رہا اور پرانے دنوں کی یادوں کو کریدتا رہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں گزرے ہوئے دنوں کی طرح اب بھی صدر ماؤ کے ساتھ ہوں۔

لانگ مارچ کے بارے میں

چینی مزدوروں اور کسانوں کی سُرخ فوج کو اپنے مشہورِ زمانہ لانگ مارچ کی تکمیل میں فوچیئن اور چیانگ سی کے جنوبی اڈوں سے لے کر شمالی شینسی تک پہنچنے کے لئے پورے دو سال (۱۰ اکتوبر ۱۹۳۴ء سے اکتوبر ۱۹۳۶ء تک) صرف کرنے پڑے اور اس نے اس دوران ۵۵ ہزار لی (یعنی ۱۲ ہزار ۵ سو کلو میٹر) کا فاصلہ طے کیا۔ سُرخ فوج لڑتے بھڑتے ہوئے گیارہ صوبوں سے گزری۔ اس نے اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں اور اسٹرٹیجک دروں کو عبور کیا۔ تند و تیز دریاؤں کو مغلوب کیا اور ایسے گھاس کے میدانوں پر اپنے قدموں کے نشان ثبت کئے۔ جہاں کبھی کسی انسان کا گزر نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف اس نے ہزاروں بار دشمن کے گھیرے کو توڑ کر آگے کا رخ کیا مجاہدوں کی بے مثال شجاعت اور حوصلہ مندی نے کمیونسٹ پارٹی کی زیرِ قیادت سُرخ فوج کی حربی قوت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا اور کوئی بھی دشمن اُسے مغلوب نہیں کر سکتا تھا۔

میں یہاں مختصر طور پر لانگ مارچ کی کہانی بیان کروں گا۔ اس کا آغاز کیوں ہوا تھا اور یہ کس طرح کامیابی پر منتج ہوا تھا اور اس کی تاریخی اہمیت کیا تھی۔

۱۹۳۹ء میں جب جاپانی سامراجیوں نے ہمارے شمال مشرقی حصے پر قبضہ کر لیا تو اس وقت چین نازک اور پیچیدہ حالات سے گزر رہا تھا۔ کومنتانگ کی حکومت نے جو جاپانی حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت کرنے اور ملک کو بچانے کے عوامی مطالبے سے چشم پوشی کر رہی تھی۔ جاپانیوں کے خلاف عدم مزاحمت کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی اور اُس نے اپنے حملوں کا رخ چینی کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ قیادت انقلابی اڈوں کی طرف کر رکھا تھا۔

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں چیانگ کائی شیک نے دس لاکھ فوجیں جمع کر کے انقلابی اڈوں اور خصوصاً چیانگ سی کے مرکزی اڈے، جس کا مرکز جوئی چن تھا، کے خلاف اپنی محاصرے کی پانچویں مہم کا آغاز کیا۔ اس وقت سُرخ فوج کے پاس پورے ملک میں ۳۰ لاکھ سپاہی تھے، اور شہری مسلح قوتوں کو بھی زبردست فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ خوراک اور دوسری اشیاء کی رسد پہلے سے کہیں زیادہ تسلی بخش تھی۔ انقلابی اڈوں میں جامع زرعی اصلاحات اور رہن سہن میں بہتر تبدیلی کی وجہ سے عوام، خصوصاً کسان، پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی کے ساتھ انقلابی جنگ کی تائید و حمایت کر رہے تھے۔

اسی سال نومبر میں "واقعہ فوچیئن" پیش آیا۔ ۱۹ ویں روٹ آرمی جس کی قیادت تسائی تنگ کائے کر رہا تھا اور جو پہلے کومنتانگ کی کمان میں تھی، فوچیئن میں "چینی ری پبلک کی عوامی انقلابی حکومت" قائم کرنے کے لئے لی چی شن اور کومنتانگ کے دوسرے اراکین کے ساتھ شامل ہو گئی اور انہوں نے سُرخ فوج کے ساتھ چیانگ کائی شیک کی مخالفت اور جاپانی حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ اس طرح محاصرے کی گذشتہ چار مہموں کے مقابلے میں اس بار سُرخ فوج کو پہلے سے زیادہ سازگار حالات میسر تھے۔

بد قسمتی سے اس وقت کمیونسٹ پارٹی میں تیسری بار "بائیں بازو" کی راہ عمل کا غلبہ ہو چکا تھا۔ بائیں بازو کے موقع پرستوں نے جن کو پارٹی میں پورا عمل دخل حاصل تھا۔ ۱۹۳۴ء کے آغاز میں مرکزی انقلابی

سُرخ فوج نے دو سال میں بارہ ہزار پانچ سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کیا

اڈے میں پہنچنے کے بعد کامریڈ ماؤزے تنگ کو ہٹا کر اڈوں اور سُرخ فوج کی قیادت پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے ۱۹ویں روٹ آرمی کے ساتھ اچھی طرح تعاون نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹ویں روٹ آرمی کو اکیلے ہی اپنا بچاؤ کرنا پڑا اور چیانگ کائی شیک کو اس کا صفایا کرنے کا موقع مل گیا۔ لیکن سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ انہوں نے کامریڈ ماؤزے تنگ کی صحیح اسٹریٹجی کو ٹھکراتے ہوئے کومنتانگ فوجوں کے مقابلے میں، جو بہتر ہتھیاروں سے لیس تھیں، باقاعدہ اور مورچہ بند جنگ کی وکالت کرکے حملہ آورانہ خطر پسندی کی راہ اختیار کر لی۔ جس کے باعث سُرخ فوج کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ بعد میں انہوں نے نام نہاد مکمل مدافعت اور فوجوں کو منتشر کرنے کے اصُول پر عمل کرکے مدافعانہ قدامت پرستی کی راہ اختیار کر لی۔ جس کی وجہ سے سُرخ فوج غیر فعال پوزیشن میں چلی گئی۔ اگرچہ ایک سال کی تلخ جدوجہد کے بعد سُرخ فوج کو جزوی طور پر کچھ فوجی کامیابی ضرور حاصل ہوئی لیکن وہ دشمن کے گھیرے کو نہیں توڑ سکی۔ اس کے برعکس اڈوں کے علاقے سمٹتے جا رہے تھے اور سُرخ فوج کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

ان حالات میں سُرخ فوج کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ اپنی قوت کو مضبوط رکھنے اور جاپانی حملہ آوروں کے خلاف لڑنے کے لئے دشمن کا گھیرا توڑ کر نکل جائے اور لانگ مارچ کی مہم شروع کرے۔

اکتوبر ۱۹۳۴ء میں پہلی فرنٹ آرمی کے بڑے دستے جو ۸۵۰۰۰ سپاہیوں (سرکاری عملے کو ملا کر ایک لاکھ) پر مشتمل تھے، کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی براہ راست قیادت میں مرکزی اڈے سے لانگ مارچ کی مہم پر روانہ ہوئے۔ مرکزی اڈے میں چھن ای اور دوسرے کامریڈوں کی قیادت میں ایک چھوٹی سی فوج چھوڑ دی گئی۔ جس کو یہ فرض سونپا گیا کہ وہ وہاں گوریلا جنگ لڑتی رہے اور گھیرے کو توڑنے میں اصل فوج کے لئے آڑ کا کام دے۔ دشمن کے ۴ لاکھ سپاہیوں پر مشتمل گھیرے کی چار لائنوں کو توڑنے کے بعد پہلی فرنٹ آرمی نومبر ۱۹۳۴ء میں ہونان اور کوانگ سی کی سرحد پر پہنچ گئی اور وہاں سے ہونان، ہوپے، سیچوان، کوئیچو اڈے کی طرف بڑھنے لگی جو دوسری فرنٹ آرمی نے قائم کیا تھا۔ چیانگ کائی شیک اس بات سے بہت خائف تھا کہ سُرخ فوج کے دو اصل یونٹ آپس میں ملنے والے ہیں۔ چنانچہ اس نے عجلت کے ساتھ سُرخ فوج سے چھ گنا بڑی فوج جمع کرکے اسے مغربی ہونان میں جا پکڑنے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے کوانگ سی کے جنگی سرداروں کو حکم دیا کہ وہ شمالی کوانگ سی سے سُرخ فوج پر حملہ کریں۔ اس طرح وہ پہلی فرنٹ آرمی کو گھیرے میں لینے اور اسے نیست و نابود کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ صورتحال بڑی سنگین تھی۔ کامریڈ ماؤزے تنگ کے اٹل عزم اور بیشتر ممتاز کامریڈوں کی تائید کے تحت پہلی فرنٹ کمیٹی نے اپنا رُخ تبدیل کر دیا اور کوئیچو کی طرف بڑھنے لگی جہاں دشمن کا دفاع کمزور تھا۔ اور اس نے تیزی کے ساتھ مشرقی کوئیچو پر قبضہ کر لیا۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں اس نے دریائے وو کو عبور کرکے جو ایک قدرتی رکاوٹ تھا، شمالی کوئیچو کے سب سے بڑے شہر زون ای پر قبضہ کر لیا۔ وہاں اس نے بارہ دن قیام کیا اور اس دوران اس کی صفوں میں تقریباً پانچ ہزار نئے مجاہدین شامل کئے گئے۔ کمیونسٹ پارٹی نے مرکزی سیاسی بیورو کا ایک توسیع شدہ اجلاس طلب کیا، جسے زون ای کانفرنس بھی کہتے ہیں۔ یہ کانفرنس چینی انقلاب کی تاریخ میں عظیم اہمیت کی حامل ہے۔

چیانگ کی محاصرے کی پانچویں مہم کے دوران غلط پالیسی اختیار کرکے سُرخ فوج کے لئے شکست کے اسباب پیدا کرنے کے بعد وہ کامریڈ جنہوں نے "بائیں بازو" کی غلطیوں کا ارتکاب کیا تھا خوف کا شکار ہو گئے۔ وہ لانگ مارچ کے آغاز میں سیاسی ایجی ٹیشن کے کام میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ پھر لانگ مارچ کے دوران انہیں صرف دشمن سے بچ نکلنے کی فکر تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سُرخ فوج کو اکثر غیر فعال کردار ادا کرنا پڑا اور اس کے حوصلے پست ہو گئے۔ انہوں نے کمان اور رسد کی تنظیمیں کافی بڑی بنائیں جس کے سبب فوج کی نقل و حرکت کی رفتار سست ہو گئی۔ سُرخ فوج کو جس کا دشمن مسلسل پیچھا کر رہا تھا اور بار بار محاصرہ کر رہا تھا۔ کئی بار خطرناک صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں زون ای تک پہنچنے تک پہلی فرنٹ فوج اپنے ساٹھ فی صد سپاہیوں سے ہاتھ دھو چکی تھی۔

جب پارٹی کے اعلیٰ اور عام اراکین نے اس سنگین صورتحال کا محاصرے کی چوتھی مہم کی فتح سے موازنہ کیا تو ان میں سے بیشتر کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ کامریڈ ماؤزے تنگ کی صحیح راہِ عمل کو مسترد کرنے اور غلط راہ عمل کا نفاذ کرنے کے سبب معاملات بگڑ گئے تھے۔ فوجوں میں شبہات اور بے چینی پھیل گئی اور وہ مرکزی عملے میں تبدیلیوں کا مطالبہ کرنے لگیں۔ صدر ماؤ کی قیادت میں بائیں بازو کی موقع پرستی کے خلاف ثابت قدمی کے ساتھ جدوجہد کی گئی۔ اور اس کا اختتام زون ای کانفرنس کی صورت میں ہوا جس نے پارٹی کے مرکز میں بائیں بازو کی راہِ عمل کے تسلط کو ختم کرکے صدر ماؤ کی سربراہی میں مرکزی کمیٹی میں صحیح قیادت قائم کر دی۔ اس طرح پارٹی اور سُرخ فوج کو آنے والے خطرے سے بچا لیا گیا۔ زون ای کانفرنس ایک ایسے موڑ کی علامت تھی جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے پارٹی کو اس قابل بنا دیا کہ وہ لانگ مارچ کو کامیابی کے ساتھ اختتام تک پہنچائے اور لانگ [مارچ] کے دوران آزمائش کے وقت پارٹی اور سرخ فوج کی قوت [برقرار] رکھے اور اس میں حرارت اور تڑپ پیدا کرے۔

زون ای کانفرنس کے بعد پہلی فرنٹ آرمی نے صد[ر ماؤ] کی دانش مندانہ قیادت میں پہل قدمی کو اپنے ہاتھ میں رکھت[ے ہوئے] لچک دار تدابیر اختیار کیں۔ فروری ۱۹۳۵ء میں اس نے زو[ن ای] کے قریب دشمن کے چار ڈویژنوں کا صفایا کرکے لانگ مارچ [کے] دوران پہلی بار بڑی فتح حاصل کی۔ اس کے بعد پہلی فرنٹ [آرمی] دشمن کو جھانسا دے کر چپکے سے آگے نکل گئی۔ اس نے مئی [کے] مہینے میں نو دن اور نو راتوں کے بعد ذرا سا بھی نقصان اٹھا[ئے بغیر] سیچوان اور یون نان کی سرحد پر تند و تیز دریا چن شا چیانگ [کو] عبور کر لیا۔

سُرخ فوج دشمن کے لاکھوں سپاہیوں کے گھیرے کو تو[ڑ چکی] تھی۔ یہ لانگ مارچ کی فیصلہ کُن فتح تھی۔ اس کے بعد سُرخ فو[ج] مغربی سیچوان سے ہوتی ہوئی شمال کی جانب بڑھی۔ اس نے د[ریائے] تاتو کو اپنے آگے جھکا لیا۔ "عظیم برف پوش پہاڑ" کا سلسلہ عبور کیا۔ [اور] جون ۱۹۳۵ء میں مغربی سیچوان میں توی اور ماؤکنگ کے مقا[م] پر پہنچ گئی اور سیچوان، شینسی اڈے کے علاقے میں چوتھی و[فرنٹ] آرمی سے جا ملی۔

چانگ کوتھاؤ کو جو چوتھی فرنٹ آرمی کا ایک لیڈر تھا، مخا[لفین] کے خلاف پانچویں مہم کی ناکامی کے بعد انقلاب پر اعتماد نہیں رہا اور [وہ] بھگوڑوں کی دائیں بازو کی موقع پرستانہ پالیسی پر عمل کرنے لگا۔ ما[رچ] ۱۹۳۵ء میں وہ اپنی فوجوں کے ساتھ سیچوان شینسی اڈے سے مغرب کی طرف چلا گیا، دراصل وہ جنوب مغربی چین کی طرف پسپا ہو[کر] بھاگنا چاہتا تھا۔ مغرب میں چیالنگ، فو اور من دریاؤں کو پار کرن[ے] کے بعد یہ فوجیں لیہ شتین اور ماؤکنگ کے علاقے میں پہلی فرنٹ آر[می] سے جا ملیں۔

کامریڈ ماؤزے تنگ نے چانگ کوتھاؤ کی غلط راہِ عمل کے خلاف اندرون پارٹی جدوجہد کی صحیح راہ عمل کا اطلاق کیا۔ اس کو عمل کے ساتھ صحیح راہ پر لگانے کے لئے پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے سیچوان کے شمال مغرب میں سنگ پان کے مقام پر ایک اہم اجلاس منعقد کیا۔ اس اجلاس نے بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ سُرخ فوج کو شمال کی جانب مارچ کرتے رہنا چاہیئے۔ آخر میں چانگ کوتھاؤ نے نیم دلی سے مرکزی کمیٹی کا یہ فیصلہ تسلیم کر لیا۔

اگست ۱۹۳۵ء میں سرخ فوج دو کالموں میں تقسیم ہو کر شمال کی طرف بڑھنے لگی۔ دائیں طرف کا کالم پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور

بائیں بازو کے موقع پرستوں نے انقلابی جدوجہد کو نقصان پہنچایا

صدر ماؤ کی قیادت میں تھا اور بائیں طرف کا کالم چوتیہہ، چانگ کوتھاؤ اور لیو پوچھنگ کی سربراہی میں تھا۔ بہرحال جب بائیں طرف کا کالم ایا کے مقام (اب یہ علاقہ سیچوان میں اپا تبتی خود اختیاری چو میں شامل ہے) پر پہنچا تو چانگ کوتھاؤ نے ایک بار پھر مرکزی کمیٹی کے فیصلے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور چوتیہہ اور لیو پوچھنگ کو حراست میں رکھ کر اپنی فوج کے ساتھ جنوب کی طرف چلا گیا۔ اس نے خفیہ طور پر چوتھی فرنٹ فوج کی دو آرمیوں کو، جو دائیں طرف کے کالم میں شامل تھیں، حکم دیا کہ وہ اس کے ساتھ جنوب کی طرف جائیں اور تھیں چھوان اور لوشان کی طرف ہٹ جائیں۔ بعد میں وہ کھلم کھلا مرکزی کمیٹی کے خلاف باتیں کرنے لگا، یہاں تک کہ اُسے تباہ کرنے کی سازش کرنے لگا۔ اب مرکزی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ وہ اکیلے ہی دائیں طرف کے کالم کو شمال کی طرف لے جائے گی۔ ستمبر میں انہوں نے سیچوان اور کانسو کی سرحد پر واقع لتیکو کی قدرتی رکاوٹ کو پار کیا اور کوہ من کو عبور کرنے کے بعد جنوبی کانسو میں داخل ہو گئے۔ اگلے ماہ وہ شمالی شینسی کے دوچھی نامی قصبے میں پہنچ گئے اور وہاں ۱۵ ویں آرمی کور کو ساتھ لے کر شمالی شینسی کی طرف بڑھنے لگے۔ نومبر میں سرخ فوج کے ان دونوں یونٹوں نے تعاقب کرنے والی دشمن کی فوج کو مار بھگایا اور شینسی، کانسو کے اڈے کو مستحکم کر لیا جس نے بعد میں شینسی، کانسو، ننگشیا سرحدی علاقے کی شکل اختیار کر لی جس کا مرکز ینان تھا۔

نومبر ۱۹۳۵ء میں دوسری فرنٹ آرمی لانگ مارچ کے دوران دشمن کے عقب میں گوریلا جنگ کے ذریعے پہلی فرنٹ آرمی کو آڑ دینے کا مشن مکمل کرنے کے بعد کم و بیش پہلی فرنٹ آرمی کے ہی راستے پر اکیلے لانگ مارچ کی منزلیں طے کرنے لگی۔ جون ۱۹۳۶ء میں دوسری فرنٹ آرمی مغربی سیچوان میں کانتسے کے مقام پر پہنچ کر چوتھی فرنٹ آرمی سے جا ملی جس کی قیادت چانگ کوتھاؤ کر رہا تھا اور جو وہاں پھنسی ہوئی وقت گزار رہی تھی۔

اب چانگ کوتھاؤ جو بڑے گھناؤنے عزائم رکھتا تھا پارٹی کے خلاف بغاوت کرنے کی حد تک پہنچ گیا۔ اس نے ایک بوگس "پارٹی مرکز" قائم کر لیا اور خود اس کا صدر بن گیا۔ اُس نے دوسری فرنٹ آرمی کے رہنماؤں کو اس بات کی ترغیب دینے کی کوشش کی کہ وہ اس کے ساتھ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی مخالفت کریں اور اس کے بھگوڑے پن کی پالیسیوں اور پارٹی دشمن تفرقہ انگیز کارروائیوں کی حمایت کریں۔ کامریڈ چوتیہہ نے کامریڈ ماؤزے تنگ کی اندرون پارٹی جدوجہد کی راہ عمل پر کاربند رہتے ہوئے اٹل سیاسی یکجہتی اور انقلابی صفات کا مظاہرہ کیا اور انہوں نے چانگ کوتھاؤ کی اس درخواست کو رد کر دیا کہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے خلاف ایک اعلان جاری کیا جائے، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کارکنوں کے درمیان مرکزی کمیٹی کی صحیح راہ عمل کی تبلیغ کرتے رہے۔ کامریڈ چوتیہہ، لیو پوچھنگ، ژن پی شیہہ اور ہوان شیانگ ینگ (موخرالذکر دو کامریڈ دوسری فرنٹ آرمی کے رہنما تھے) پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی صحیح راہ عمل کی اٹل حمایت کرتے رہے اور چانگ کوتھاؤ کی بھگوڑے پن کی پالیسی اور اندرون پارٹی تفرقہ انگیز کارروائیوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔ دوسری طرف چوتھی فرنٹ آرمی کے کارکنوں میں نمایاں طور پر چانگ کوتھاؤ کی غلط راہ عمل کے خلاف بیداری پیدا ہونے لگی اور ان کی طرف سے جاپان کے خلاف مزاحمت کرنے کے لئے شمال کی جانب بڑھنے کا مطالبہ زور پکڑنے لگا۔ جن کے باعث چانگ کوتھاؤ کی غدارانہ تفرقہ انگیز سازشوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسے اپنا بوگس "پارٹی مرکز" توڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اور اُسے جولائی میں چوتھی فرنٹ آرمی کو دوسری فرنٹ آرمی کے ساتھ شمال کی طرف لے جانا پڑا۔ جو اکتوبر میں صوبہ کانسو میں ہوئی ننگ کے مقام پر پہلی فرنٹ آرمی سے جا ملیں۔ سرخ فوج ان تینوں اصل افواج — پہلی، دوسری اور چوتھی فرنٹ آرمی — کے ملنے سے لانگ مارچ فتح مندی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

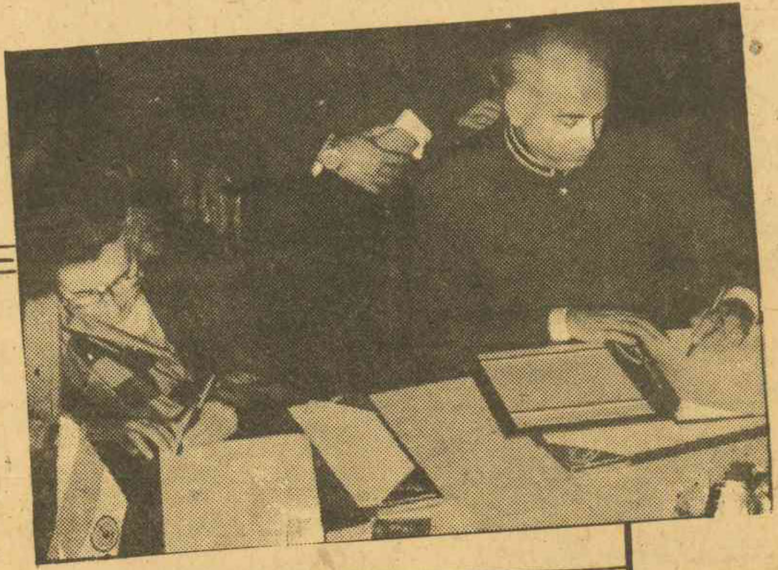
لانگ مارچ ایک بے مثال رزمیہ ہے۔ جس کی چینی تاریخ میں کہیں مثال نہیں ملتی۔ اس دوران سرخ فوج نے بالترتیب ان گیارہ صوبوں فوچین، چیانگ شی، کوانگ تونگ، ہونان، کوانگشی، کویچو، یون نان، سیکانگ، سیچوان، کانسو اور شینسی پر محیط ۲۵۰۰۰ لی کا فاصلہ طے کیا۔ اس دوران چیانگ کائی شیک نے اپنی لاکھ آرمی اور فضائی یونٹوں کی پوری سرگرمی کے ساتھ استعمال کیا۔ مختلف صوبوں میں جنگی سرداروں اور جاگیرداروں کی مسلح قوتوں کے اشتراک سے کام لیا اور سُرخ فوج کی راہ میں قدرتی رکاوٹوں کے کنارے دفاعی انتظامات کر کے مسلسل حملے کرتا رہا۔ سُرخ فوج نے ایک ایسے دشمن سے جو ہم سے کہیں بہتر ہتھیاروں سے مسلح تھا اور تعداد میں بھی بہت زیادہ تھا، براہ راست مقابلے سے گریز کرنے کے لئے بے آب و گیاہ خطوں، بلند پہاڑوں، تند و تیز دریاؤں اور خطرناک دلدلوں اور راستوں اور خاص طور پر سیچوان میں سطح سمندر سے پانچ ہزار میٹر بلند برف پوش پہاڑوں اور اس کے خطرناک دلدلی علاقوں سے گزرنا پڑا۔ یہ علاقے افلاس کا شکار تھے۔ ان کی آبادی چھدری تھی اور وہاں اناج کا کال تھا۔

لیکن اس قسم کی کوئی بھی مشکل اور کوئی بھی خطرہ سُرخ فوج کو لانگ مارچ کی فتح کا دروازہ نہ بند کر سکا۔ اس کی پہلی اور سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ سُرخ فوج کی قیادت ایک مارکسی، لینینی پارٹی چینی کمیونسٹ پارٹی، کر رہی تھی۔ ۱۹۲۱ء میں اپنے قیام کے بعد پارٹی طویل انقلابی جدوجہد کی بھٹی میں تپ کر کندن بن چکی تھی۔ مارکسی، لینینی نظریے کو چین کے انقلابی عمل سے مربوط کرنا سیکھ چکی تھی، خاصا تجربہ، خاص طور پر انقلابی جنگوں کا تجربہ، حاصل کر چکی تھی اور قیادتی عملے کے لئے بہت بڑی تعداد میں کارکن تیار کر چکی تھی۔ زون ای کانفرنس کے بعد صدر ماؤ کی سربراہی میں پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے صحیح راہ عمل کی روشنی میں کام کیا۔ وہ نہ صرف ہر قسم کے دشمنوں کے خلاف جدوجہد کرنے میں مہارت حاصل کر چکی تھی، بلکہ پارٹی کے اندر غلط رجحانات کے خلاف جدوجہد کرنے کے بھی قابل ہو گئی تھی۔ لانگ مارچ کا ہر مرحلہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس میں بائیں بازو کی غلط راہ عمل کی مکمل اصلاح اور کامریڈ ماؤزے تنگ کی صحیح راہ عمل کے اطلاق اور چانگ کوتھاؤ کی دائیں بازو کی موقع پرستانہ راہ عمل اور تفرقہ انگیز سازشوں کے خلاف اٹل جدوجہد اور کامریڈ ماؤزے تنگ کے صحیح نظریات کے اطلاق کی بدولت فتح حاصل ہوئی تھی۔ پارٹی اور کامریڈ ماؤزے تنگ کی صحیح قیادت کے بغیر سُرخ فوج کے لانگ مارچ کی فتح کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

کامریڈ ماؤزے تنگ نے مندرجہ ذیل سطور میں لانگ مارچ کی اہمیت کا واضح الفاظ میں نشاندہی کی ہے۔

لانگ مارچ کے سلسلے میں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ اس کی کیا اہمیت ہے؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ لانگ مارچ تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا واقعہ ہے۔ یہ ایک منشور ہے۔ اس نے ساری دنیا پر یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ سُرخ فوج مجاہدوں کی فوج ہے، جب کہ سامراجی اور اُن کے پالتو کتے چیانگ کائی شیک اور اس جیسے دوسرے لوگ بالکل نکمے ہیں۔ اس نے ہمارے گرد گھیرا ڈالنے، ہمارا تعاقب کرنے، ہمارے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے اور مزاحم ہونے میں سامراج اور چیانگ کائی شیک کی قطعی ناکامی کا اعلان کر دیا ہے۔ لانگ مارچ ایک تشہیری قوت بھی ہے۔ اُس نے

باقی صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ فرمائیں



تضاد کا خا

شملہ معاہدہ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ۔ قومی اسمبلی اس معاہدے کی بیک زبان منظوری دے چکی ہے ۔ ضروری ہے کہ ہم ان وجوہات کا تجزیہ کریں جس کی وجہ سے ہم بھارت کے ساتھ مخاصمانہ کش مکش سے دوچار ہوتے ۔ اور ان متوقع اثرات کا معروضی جائزہ لیں جو اس معاہدے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں۔

بھارت کے ساتھ معاندانہ تعلقات اور اس سلسلہ میں نتیجہ پذیر ہونے والی جنگوں کی بنیادی وجہ بھارت کی توسیع پسندانہ سیاست ہے ۔ ہم اس تضاد میں اس وجہ سے اس وقت مبتلا ہیں کہ ہم معاشی اور دفاعی اعتبار سے اتنے منظم اور مضبوط نہیں ہیں کہ بھارت کا مقابلہ کر سکیں ۔ حالانکہ بھارت دنیا کا کمزور ترین سامراج ہے۔ اس بونے سامراج کا مقابلہ کرنا دشوار نہیں ہونا چاہیئے ۔ درحقیقت ہمیں اگر ایک آزاد اور خود مختار قوم کی طرح زندہ رہنا ہے تو ہمیں امریکی سامراج اور روسی سوشل سامراج کے مقابلے کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے ۔ ویت نام کی جنگ آزادی کے بعد ہم یہ دلیل سننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہمارا ملک یا کوئی بھی دوسرا ملک سامراج کے کاغذی شیروں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔

دوسرے مرحلے پر ہم اس وقت تک صورت حال کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے جب تک ہم بھارت کی توسیع پسندانہ پالیسی کی وجوہات کو نہ سمجھ سکیں ۔ ان وجوہات کا تجزیہ کئے بغیر ہم اس امید میں بیٹھے رہے کہ کسی جادو منتر سے بھارت خود بخود اپنی توسیع پسندانہ پالیسی ترک کر دے گا ، تو یہ ہماری خام خیالی ہو گی ۔ ہم اس سلسلے میں دھوکا کھا چکے ہیں ۔ مزید دھوکا کھانے کی ضرورت نہیں ۔

بھارت کی توسیع پسندانہ خارجہ پالیسی بھارت کے داخلی تضادات کا نتیجہ ہے ۔ بھارت کی تحریک آزادی کے دوران کانگریس نے سوشلزم کے نعرے کو اپنایا ۔ یہ حقیقت ہے کہ بھارت نے آزادی کے بعد کسانوں میں زمینوں کو تقسیم کیا اور جاگیرداریوں کا خاتمہ کیا۔

لیکن بھارت کے بڑے بڑے صنعت کار اس امید میں تھے ، کہ آزادی کے بعد ان کو صنعت اور تجارت میں بیرونی صنعت کار کے مقابلے میں تحفظ دیا جائے گا ۔ چنانچہ وہ کانگریس اور آزادی کی تحریک کی حمایت کرتے رہے ۔ دوسری جانب وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ جاگیردار طبقہ انگریزوں کا حاشیہ بردار ہے ۔ ان کا پرانا غلام ہے اور جد و جہد آزادی کی مخالفت کر رہا ہے ۔ اس طرح کانگرس میں اور جاگیردار طبقے میں ایک بہت بڑا تضاد ہے ۔ جس کے نتیجے میں ہندوستان میں جاگیرداری ختم ہو کر رہے گی۔

پرولتاریہ اور کسانوں نے آزادی اور سوشلزم کے نام پر کانگریس کا ساتھ دیا ۔ سرمایہ داروں نے اپنے مقاصد کی خاطر کانگریس کی پوری طرح مالی امداد کی ۔ آزادی کے بعد جاگیرداری ختم کی گئی لیکن سرمایہ داری اور مضبوط ہوئی ۔ سرمایہ دار اپنے تحفظات چاہتا تھا ۔ جس کے لئے بھارت کی کانگریس کو سوشلزم کے نعرے سے غداری کرنی تھی لیکن ۵۰ء کے اوائل تک پنڈت نہرو کی سحر انگیز شخصیت کا جادو قائم تھا اور پھر یہ کہ تمام تر اصول پس پشت نہیں ڈالے گئے تھے ۔ پرولتاریہ کو نہرو سے امیدیں تھیں ۔ لیکن پرولتاری جد و جہد کی غیر موجودگی میں آہستہ آہستہ سرمایہ دار بھارت میں مضبوط ہوتا جا رہا تھا ۔ جب تک پرولتاریہ کے مفادات پوری طرح پس پشت نہیں ڈالے گئے تھے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا اثر بھارت کی خارجہ پالیسی میں ظہور پذیر رہا ۔ بھارت کشمیریوں کے حق خود اختیاری کو تسلیم کرتا تھا ۔ بھارت بنڈونگ کانفرنس میں ملکوں کے درمیان باہمی تعلقات کے اصولوں پر دستخط کرتا تھا بھارت چین کے ساتھ دوستانہ پالیسی اختیار کرتا

تھا اور سرحد کی حد بندی کیلئے مذاکرات کا قائل
ہم دیکھتے ہیں کہ اگر بھارت کشمیر کے عوام کی حق
کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے ۔ بنڈونگ کے اصولوں ا
رائے عامہ کو ٹھکراتے ہوئے پاکستان پر حملہ کرتا ہے ۔ سرح
کے مسئلہ میں چین کو دھکیلنے کی کوشش میں چین پر حملہ آور ہو
اس کی اصل وجہ کسی نہ کسی صورت میں بھارت کے سرما
کا مزید استحکام اور بھارت کی حکومت پران کا مکمل کنٹرول
شاید کچھ لوگ کہیں کہ اندرا گاندھی نے بنک قومی ملکیت
لے لئے اور سرمایہ داروں کے مفاد کے خلاف کام کیا ۔ ۲۳
ہندوستان پر حکومت کرنے کے بعد اگر انتخابات میں اپنی پا
شکست سے بچانے کے لئے بنکوں کو قومیانے کا نعرہ لگانا پڑ
اور بنکوں کو سرمایہ داری کنٹرول سے نکال کر نوکر شاہی کے کن
میں دے دیا جاتا ہے تو ہم اس کو پرولتاریہ کی فتح نہیں کہیں گے
اقدام نوکر شاہی اور سرمایہ داری کے بین الاقوامی گٹھ جوڑ کا
ہے ۔ بھارت میں چلنے والی سوشلسٹ تحریکوں کو بے دردی س
کچلا جا رہا ہے ۔ مغربی بنگال کی نکسل باڑی تحریک ، کیرالا ، تلنگا
آندھرا ، راجستھان ، ان سب علاقوں میں آخر کیا ہو رہا ہے ۔ حا
ہی میں تامل ناڈ میں کسانوں کا قتل عام کیا گیا ہے اور تحریک
کارکنوں کو جیلوں میں ٹھونسا گیا ۔ کلکتہ میں کامریڈ چارو مجمدار کو گر
کیا گیا اور جن کا اسیری میں انتقال ہو گیا ۔ مزدوروں اور کسانو
پر ظلم کیا جا رہا ہے ۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ مفادات کا یہی مطالبہ
دوسری جانب بھارت کی حکومت بھی یہ ضروری سمجھتی ہے کہ مختل
بہانوں سے سوشلسٹ تحریک کو عوام سے دور رکھا جائے ۔ ان میں
آپس میں رابطہ نہ پیدا ہو ۔ مختلف علاقوں میں چلنے والی تحریکوں کو
ایک دوسرے سے جدا رکھا جائے ۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن
کہ بھارت کے عوام کی توجہ طبقاتی جد و جہد سے ہٹا کر منفی سمت
میں لگا دی جائے ۔ بھارتی حکومت یہ کام پاکستان ، چین اور دو

نین، بھارت اور پاکستان میں صلح کرا کر اپنی جارحیت پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے

شملہ معاہدہ کا تجزیہ

کئے بغیر — کاغذی معاہدے پائیدار امن کی ضمانت نہیں بن سکتے

تاج حیدر

پڑوسی ممالک کے خلاف نفرت کا پروپیگنڈہ کرکے کرتی ہے! اور وقتاً فوقتاً اپنے عوام کو ایسی باتیں سناتی رہتی ہے جس سے ان کا جذبۂ نفرت ابھرتا ہے۔ چین کے خلاف جنگ کشی کرکے بھارت نے سامراجی ممالک سے امداد بٹوری اور اپنے ہاں کے ملٹری بجٹ کو بڑھانے کا جواز پیدا کیا۔ ۶۵ء میں پاکستان پر جنگ کشی کی۔ اور اب مشرقی پاکستان کی فتح کے بعد اسی "نفرت کی سیاست" پر پھر سے الیکشن کرا کے جائز ناجائز طریقے سے کامیابی حاصل کی۔

بھارت کی توسیع پسندانہ اور سامراجی پالیسیوں کی دوسری بڑی وجہ پڑوسی ملکوں میں اس کے تجارتی مفادات ہیں۔ بھارتی سرمایہ دار بڑی سے بڑی منڈی چاہتے ہیں جس میں انہیں استحصال کرنے کی مکمل آزادی ہو۔ مشرقی پاکستان سونا دینے والی ایک منڈی کی حیثیت سے انہیں حاصل ہو گئی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ کاغذی معاہدے ہندوستان کے اندرونی تضادات اور ہمارے اور اس کے آپس کے تضادات کو حل نہیں کر سکتے۔ تاشقند میں ہم نے ہندوستان کی حکومت کے قدموں پر اپنی قومی عزت رکھ دی تھی۔ ہم نے معاہدۂ تاشقند کی پوری پابندی کی۔ لیکن ۱۹۷۱ء میں کیا ہوا۔ کشمیر میں پاکستان اور بھارت دونوں نے ۴۹ء کی قرارداد پر دستخط کئے۔ معاہدے کئے لیکن کشمیر میں کیا ہو رہا ہے؟ دوسری جنگ عظیم سے قبل ہٹلر نے کتنے ہی ملکوں سے جنگ نہ کرنے کے معاہدے کئے تھے۔ امریکہ اور روس نے ہتھیاروں پر پابندی کے معاہدے (salt) پر دستخط کرنے کے فوراً بعد نئے نئے ہتھیاروں کی تیاری شروع کر دی۔ نکسن روس سے معاہدہ کرکے آئے۔ ان کے ایلچی بار بار چین جاتے ہیں لیکن جنوب مشرقی ایشیا میں کیا ہو رہا ہے؟

تمام پاکستانیوں پر یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ شملہ معاہدہ یا اس کے بعد کئے جانے والے دوسرے معاہدے کسی بھی صورت میں پائیدار امن کی ضمانت نہیں بن سکتے۔ ہم حالتِ جنگ میں ہیں اس وقت تک حالتِ جنگ میں رہیں گے۔ جب تک توسیع پسندی کے خلاف تضاد مکمل طور پر حل نہیں ہو جاتا۔ پائیدار امن بندوق کی نال سے جنم لیتا ہے لیکن اس تضاد کو حل کرنے میں ہندوستان کے محنت کش عوام، وہاں کی بائیں بازو کی پارٹیاں، وہاں کی اقلیتیں ہمارے قابلِ قدر اتحادی ثابت ہو سکتے ہیں اور بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے صحیح اور جائز موقف کو ہندوستان کے عوام تک پہنچانے کے لئے ہندوستان کی حکومت سے بات چیت کا کوئی بھی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیئے۔

عمومی صورتِ حال کے بعد ہم مخصوص شملہ معاہدے پر آتے ہیں۔ صدر ذوالفقار علی بھٹو کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں نے بار بار یہ کہا ہے کہ ترپ کے سارے پتے اندرا گاندھی کے ہاتھ میں ہیں، اور ہمارے ہاتھ خالی ہیں۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک بہت اہم ترپ کا پتہ جس کا اظہار صدرِ مملکت نے بارہا شروع کے دنوں میں کیا ہے۔ عالمی رائے عامہ ہے۔ ۱۰۵ ملکوں کا یہ موقف کہ پاکستان کے اوپر جارحیت ہوئی ہے کافی وزن رکھتا ہے۔ صدر ذوالفقار علی بھٹو نے کئی دفعہ یہ کہا ہے کہ یہ پاکستان کی سیاسی جیت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ملک بہت زیادہ عرصے تک عالمی رائے عامہ کو نہیں ٹھکرا سکتا۔ بھارت کو بھی اسی دُنیا میں رہنا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں اس کے تجارتی مفادات ہیں۔ مشرقی پاکستان پر قبضے کے بعد دنیا کے سامنے بھارت کی ایک نئی اور ناپسندیدہ شکل ابھر کر آئی۔ افسوس یہ ہے کہ ہمارے سفارتخانے اور وزارتِ اطلاعات اس صورتِ حال کا پوری طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ لیکن صدر بھٹو کے بیرونی دورے، ان کے پریس انٹرویو بھارت کی توسیع پسندانہ سیاست سے دوسرے ممالک کے عوام کو باخبر کرنے میں معاون ثابت ہوئے اور خاص طور سے مشرقِ وسطیٰ میں پاکستان کے تجارتی مفادات کو فائدہ اور ہندوستان کے تجارتی مفادات کو نقصان پہنچا۔ بھارت دنیا کے سامنے اپنی امیج درست کرنا چاہتا ہے۔ اس کام میں بھارت کے سیاستدان ماہر بھی رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ صرف سوویت یونین کی دوستی ہی کافی نہیں ہے۔ سوویت یونین نے بھی ایک کے بعد ایک ویٹو کرکے دنیا کے سامنے جو دھاندلی کی تھی۔ اُسے خود پاکستان سے اچھے تعلقات قائم کرکے اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خوشگوار تعلقات پیدا کرکے ذہنوں سے محو کرانا چاہتا ہے۔

یہ تمام عوامل ایسے ہیں جو بھارت کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف پاکستان سے بات چیت کرنے بلکہ پاکستان کے علاقے خالی کرنے اور جنگی قیدیوں کی واپسی کے لئے مثبت اقدام



صدر بھٹو، مسز اندرا گاندھی اور سردار سورن سنگھ مذاکرات کے بعد

مسئلہ کشمیر کے مذاکرات میں کشمیری عوام کو شریک کیا جائے

کرے۔ بصورتِ دیگر پاکستان کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ ان مسائل پر بار بار بھارت کو مشکل میں ڈالے اور نہ صرف یہ کہ عالمی رائے عامہ بھارت کے خلاف کرے بلکہ بھارت کے تجارتی مفادات کو بھی نقصان پہنچائے۔

ان تمام حالات میں صحیح پالیسی یہی ہے کہ پاکستان اپنے جائز موقف پر اڑا رہے۔ شملہ کانفرنس میں یہی کیا گیا۔ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ عین شملہ کانفرنس کے دوران اندرا گاندھی اور شیخ مجیب الرحمٰن کے نام کوسیجن کے خطوط آتے ہیں۔ کیا ان خطوط میں یہ زور ڈالا گیا تھا کہ ہر صورت میں شملہ کانفرنس کے کچھ نہ کچھ نتائج نکلنے چاہئیں۔ صدر بھٹو باہر جانے سے پہلے بارہا کہہ چکے تھے کہ وہ جائز موقف سے نہیں ہٹیں گے اور اگر ضروری ہوا تو وہ شملہ کانفرنس کو لات مار کر باہر نکل آئیں گے۔ بھارت جانتا ہے کہ وہ اس صورت میں نہ صرف صدر بھٹو کی اندرونِ ملک مقبولیت میں اضافہ ہوتا بلکہ کانفرنس کی ناکامی کو صدر بھٹو تیسری دنیا کے ممالک میں اور باقی دنیا میں بھارت کا وقار گرانے اور بھارت کے تجارتی مفادات کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کرتے۔ دوسری طرف روس جو صلح کرانے کا کردار ادا کرنا چاہتا ہے اور اقوام متحدہ میں اپنی ہٹ دھرمی پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد بھی شملہ کانفرنس کی ناکامی کی صورت میں دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ اس صورتِ حال میں کوسیجن نے یقیناً بھارتی حکومت کی ہدایت کی ہو گی کہ شملہ کانفرنس میں کسی نہ کسی بات پر ضرور اتفاق رائے ہونا چاہیئے۔

سندھ اور پنجاب کے علاقے سے حملہ آور فوج کا نکلنا، پاکستان کے مفاد میں ہے۔ اور اس سلسلے میں ذوالفقار علی بھٹو کو کانفرنس میں کامیابی ہوئی ہے۔

مشرقی پاکستان کا مسئلہ

بھٹو صاحب شملہ جانے سے بہت پہلے سے یہ کہہ رہے تھے کہ وہ

"بھارتی لیڈروں سے بھارت کی سرزمین پر بنگلہ دیش کے سوال پر کوئی بات چیت نہیں کریں گے۔"

شملہ میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے "بنگلہ دیش" کے متعلق جواب دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے جانے سے پندرہ روز پہلے ہی سے ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن سے "مذاکرات" کے عنوان سے شملہ کانفرنس کے متعلق جو پروگرام آ رہے تھے، اس میں سارا پروپیگنڈہ "بنگلہ دیش" تسلیم کرنے پر دیا جا رہا تھا۔

جنگی قیدیوں کے مسئلہ پر صدر بھٹو نے ہندوستان کا موقف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پاکستانی موقف یہ تھا کہ جنگی قیدی صرف بھارت کی ذمہ داری میں۔ مشرقی پاکستانی فوج نے بھارت کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ بھارت اور "بنگلہ دیش" کی مشترکہ کمان کے سامنے نہیں۔ لہٰذا جنیوا کنونشن کی رُو سے بھارت کو براہِ راست قیدی واپس کرنے چاہئیں۔

اس سلسلے میں ہمیں ناکامی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ جنگی قیدی واپس نہیں آئے کیونکہ یہ تو وقتی بات ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ صدر بھٹو نے اپنی پنڈی کے ہوائی اڈہ کی تقریر میں کہا کہ "جنگی قیدیوں کی واپسی کے سلسلے میں ہم ڈھاکہ کے حکام سے بات چیت کریں گے۔" ان کا یہ اعلان واضح طور پر بھارت کے موقف کو تسلیم کرتا ہے کہ جنگی قیدی بھارت اور "بنگلہ دیش" کی مشترکہ کمان کی ذمہ داری میں اور بھارت "بنگلہ دیش" کی اجازت کے بغیر جنگی قیدیوں کو واپس نہیں کر سکتا۔

اس سلسلے میں جذباتی ہو کر نہیں بلکہ حقیقت پسندی سے سوچنا ہو گا۔ ہمیں اس مسئلہ پر شملہ کانفرنس میں اپنی فنی ناکامی کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ ۹۳ ہزار پاکستانی اس وقت بھارت کی قید میں ہیں ہمیں ان کو وطن واپس لانا ہے۔ بھارت اور "بنگلہ دیش" اس بات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وہ کچھ قیدیوں کے سلسلہ میں مقدمات چلانے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ نئی نئی باتیں کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتحال کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟ ہمارے ہاتھ میں صرف ایک ترپ کا پتہ ہے وہ ہے عالمی رائے عامہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم جنگی قیدیوں کے مسئلے پر عالمی رائے عامہ ہموار کر سکتے ہیں اور بھارت اور "بنگلہ دیش" پر زور، ڈال سکتے ہیں۔ اگر پاکستانی فوجیوں نے نہتے شہریوں کا قتلِ عام کیا ہے۔ تو یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈھاکہ کے علاوہ سارے مشرقی پاکستان میں مارچ اور اپریل ۷۱ء میں عوامی لیگیوں نے نہتے غیر بنگالیوں کا قتل عام کیا ہے۔ ایسے تمام لوگ اس وقت "بنگلہ دیش" میں موجود ہیں نہ صرف موجود ہیں بلکہ "بنگلہ دیش" کی مسلح افواج اور بنگلہ دیش کی کٹھ پتلی حکومت میں عہدوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیا شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت انسانیت کے خلاف ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں پر مقدمہ چلا رہی ہے۔ اگر وہ فوجیوں پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کرتی ہے تو کیا وہ ایسے تمام عوامی لیگیوں کو جنہوں نے غیر بنگالیوں کا قتل عام کیا ہے ہمارے حوالے کر سکتی ہے تاکہ ہم ان پر مقدمہ چلائیں۔ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ پاکستانی فوجیوں پر جن سے جنگی جرائم سرزد ہوئے ہیں پاکستان کی حکومت مقدمہ چلائے اور جن عوامی لیگیوں نے بے گناہ غیر بنگالیوں کو مارچ اور اپریل ۷۱ء میں قتل کیا ہے ان پر "بنگلہ دیش" میں مقدمہ چلایا جائے۔ ہمیں اس موقف کو لے کر آگے بڑھنا چاہیئے۔

[illegible] بھٹو کہتے ہیں کہ انہوں نے بھارت کی حکومت سے کوئی خفیہ بات چیت نہیں کی۔ جو بھی بات ہوئی ہے۔ جن امور پر رضامندی ہوئی ہے وہ سب کے سب معاہدے میں موجود ہیں۔ جنگی قیدیوں کے مسئلے پر ہندوستان کا موقف تسلیم کرنے کی بات معاہدے میں نہیں ہے اس موقف کو تسلیم کیا گیا ہے۔ پھر یہ کیسے کہا جاتا ہے کہ خفیہ بات چیت نہیں ہوئی۔؟

"بنگلہ دیش" تسلیم کرنے کے مرحلے کے دو پہلو ہیں۔ اور ہمیں ان دونوں پر غور کرنا چاہیئے۔

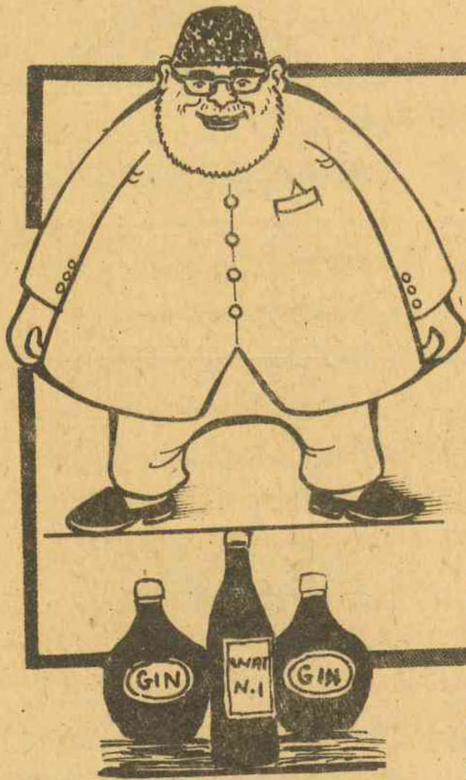
(۱) اس حقیقت کو تسلیم کرنا کہ مشرقی پاکستان ہم سے جدا ہو چکا ہے۔ آزاد ہو چکا ہے۔ ہم طاقت کے ذریعے مشرقی پاکستان کو واپس نہیں لے سکتے۔ اور اس سلسلے میں آخری فیصلہ وہاں کے عوام کے ہاتھ میں ہے۔

(۲) مسٹر مجیب الرحمان کی کٹھ پتلی حکومت کو وہاں کی جائز حکومت تسلیم کرنا۔ اس بات کو تسلیم کرنا کہ وہاں کے عوام مسٹر مجیب کی کٹھ پتلی حکومت کے ساتھ ہیں۔ مولانا بھاشانی اور ڈاکٹر طحٰہ کی تحریک کے ساتھ نہیں ہیں۔

"بنگلہ دیش" کو سرکاری طور پر تسلیم کرنے سے قبل صورت حال یہ ہے کہ ہم اس پہلی والی حقیقت کو تسلیم نہیں کر رہے، بلکہ ہم ابھی تک مشرقی پاکستان کو پاکستان کا ایک صوبہ سمجھتے ہیں اور اس طرح سے اپنے اس حق کو محفوظ رکھتے ہیں کہ بزورِ طاقت اس صوبے کو باقی ملک کے ساتھ ملا لیا جائے گا۔ موجودہ صورت میں ہم چاہیں اسے سرکاری طور پر تسلیم نہ کریں۔ مغربی پاکستان کے عوام اور مشرقی پاکستان کے عوام دونوں علیحدگی کی حقیقت کو تسلیم کر رہے ہیں۔ صدر بھٹو خود کئی تقریروں میں یہ کہہ چکے ہیں۔ کہ میں مشرقی پاکستان کے نمائندوں سے آخری دفعہ بات چیت کرنے کے بعد وعلیکم السلام کہہ دوں گا۔

لیکن اس "وعلیکم السلام" کا یہ مقصد نہیں کہ ہم اس تضاد کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جو "بنگلہ دیش" کے محنت کش [illegible] مسٹر مجیب کی کٹھ پتلی حکومت میں پایا جاتا ہے۔ یہ تضاد معاندانہ تضاد ہے۔ یہ کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ بھارت اور مسٹر مجیب کی حکومت ڈاکٹر طحٰہ اور مولانا بھاشانی کی بائیں بازو کی تحریکوں کو کچلنے کے لئے اندھادھند کارروائی کر رہی ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوام مسٹر مجیب کی حکومت کے خلاف ہو چکے ہیں۔ ہتھیار اٹھا چکے ہیں۔ ایسی صورت میں مسٹر مجیب کی کٹھ پتلی حکومت کو دعوت دینا کہ وہ تمام مسائل پر بات کریں ان کے کنٹرول کو جائز کنٹرول تسلیم کرنا ہے۔ وہ وہاں کے عوام کے

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں



پانچ لاکھ روپے کی سیاسی رشوت

جماعتِ اسلامی اور شراب فروشوں کا خفیہ سمجھوتہ

شاھد

کچھ لوگ شراب پیتے ہیں، کچھ لوگ شراب فروخت کرتے ہیں، کچھ شراب کی دکانیں لوٹتے ہیں۔ شراب کے کاروبار سے کسی نہ کسی طور تعلق رکھنے والے یہ لوگ علیحدہ علیحدہ خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ ان کے درمیان بڑا گہرا رشتہ ہے اس حقیقت کا انکشاف شراب فروشوں کے ایک ترجمان نے ایک نجی محفل میں کیا۔ وہ کراچی کے حالیہ ہنگاموں پر تبصرہ کر رہے تھے جن میں شراب کی دکانوں پر کثرت سے حملے ہوئے، توڑ پھوڑ ہوئی، لوٹ مار مچی اور بہت سی دکانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا

اِن حملوں میں بہت سے سیلزمین اور چوکیدار زخمی ہوئے ایک شراب فروش ہلاک ہو گیا۔ یہ حملے عام طور پر کرفیو کے اوقات میں ہوئے۔ حملہ آوروں کا طریقِ کار یہ تھا کہ پہلے وہ دکانوں کی نگرانی کرنے والوں کو مار پیٹ کر زخمی کر دیتے یا انہیں جان بچا کر بھاگ جانے پر مجبور کر دیتے اس کے بعد دکان کے تالے توڑے جاتے۔ حملہ آور سب سے پہلے کیش پر ٹوٹ پڑتے جو نقدی جس کے ہاتھ لگتی وہ اسے فوراً اپنے قبضے میں کرتا پھر قیمتی اور عمدہ شراب کی بوتلوں کو چن چن کر جیبوں میں بھر لیا جاتا جب جیبیں بھر جاتیں تو بغلوں اور ہاتھوں میں بوتلیں دبا کر کچھ لوگ موقع واردات سے کھسک جاتے۔

اس دوران توڑ پھوڑ بھی جاری رہتی۔ شوکیس توڑے جاتے، فرنیچر تباہ کیا جاتا جس میں شراب کی بوتلیں بھی ٹوٹتیں۔ اگر اس دوران پولیس نہ پہنچے تو حملہ آور دکان میں آگ لگا دیتے لیکن آگ لگانے سے پیشتر جتنی بوتلیں ان کے ہاتھ لگ جاتیں انہیں مالِ غنیمت سمجھ کر اپنے ساتھ لے جاتے۔

علاوہ ازیں توڑ پھوڑ اور لوٹ مار کے ساتھ ساتھ حملہ آور بوتلیں کھول کر غٹاغٹ شراب بھی چڑھاتے جاتے ایسے واقعات تقریباً ہر حملے کے موقع پر پیش آئے۔ ایسے لوگ نشے کی ترنگ میں زیادہ دیوانگی کا مظاہرہ کرتے، راہگیروں پر حملہ کر دیتے یا دوسرے حملہ آوروں کے ساتھ جھگڑا فساد شروع کر دیتے۔ چنانچہ بندر روڈ پر واقع شراب کی ایک دکان پر حملہ ہوا تو اتفاق سے پولیس بروقت پہنچ گئی۔ جو حملہ آور گرفتار ہوئے ان میں بیشتر ایسے تھے جو نشے میں دھت تھے۔ کچھ لوگ ایسے پکڑے گئے۔ جو شراب کی بوتلیں لوٹ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

صرف یہی نہیں۔ ایسے عینی شاہد موجود ہیں جن کے روبرو شراب کی بوتلیں لوٹنے والوں کے درمیان بعد میں مالِ غنیمت کی حصہ بانٹ پر آپس میں جھگڑے ہوئے۔ بوتلیں فراخدلی سے چلیں ٹوٹیں اور چکنا چور ہوئیں۔ کچھ زخمی ہوئے، کچھ بھاگ گئے۔ اور اپنی لوٹ کی یادگار سڑکوں پر بکھرے ہوئے شیشے اور بہتی ہوئی شراب کی تیز بو چھوڑ گئے۔

ترجمان نے بتایا کہ حملہ آور لوٹ کی شراب خود بھی پیتے ہیں اور بازار میں جا کر فروخت بھی کر دیتے ہیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ خود ان کی دکان کی لوٹی ہوئی شراب کی بوتلیں ان کے پاس فروخت کے لیے آئیں۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ شراب کی دکانوں پر حملہ کرنے والے ٹیڈی یا ہپی قسم کے نوجوان نہیں ہوتے۔ ان میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جن میں اکثر داڑھیوں والے ہوتے ہیں۔ جنہیں توڑ پھوڑ کے دوران قسم قسم کی داڑھیوں کے ساتھ شراب پیتے اور شراب پی کر بدمست ہوتے بھی دیکھا گیا۔

انہوں نے بتایا کہ یہ بالکل غلط تصور ہے کہ شراب کا کاروبار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے اس کاروبار میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ان میں بیشتر راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ نماز روزہ کے پابند ہیں۔ اس سلسلے میں خود انہوں نے اپنی مثال پیش کی اور یہ جواز پیش کیا کہ جب ملک کا تمام کاروبار سود پر چلتا ہے جس کا لینا اور دینا از روئے شریعت حرام ہے تو شراب فروشی کو محض کاروبار کی حیثیت سے اختیار کرنے میں کیا قباحت ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ صرف ان کا خیال نہیں بلکہ شراب فروخت کرنے والے مسلمان ڈیلروں میں یہ خیال عام طور پر پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا تعلق جماعتِ اسلامی سے ہے جو دامے درمے اور سخنے اس کی امداد بھی کرتے ہیں

ترجمان سے سوال کیا گیا کہ اگر ان کی بات درست مان لی جائے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ شراب کی دکانیں لوٹی جائیں اور وہ بھی جماعتِ اسلامی اور اسلام پسندوں کے ہاتھ؟

اس سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ یہ درست ہے کہ شراب کی دکانوں پر حملے کرنے والے عام طور پر جماعتِ اسلامی اور ایسی ہی دوسری اسلام پسند سیاسی جماعتوں کے کارکن اور ہمدرد ہوتے ہیں بلکہ ان جماعتوں کی جانب سے جب بھی کوئی ہڑتال مظاہرہ یا ہنگامہ ہوتا ہے تو سرمایہ داروں کے کارخانوں اور بینکوں کے بجائے صرف اور صرف شراب کی دکانیں، توڑ، پھوڑ، آتش زنی اور لوٹ مار کا نشانہ بنتی ہیں۔

اس کا سبب انہوں نے یہ بتایا کہ اس مسئلہ کو پیدا کرنے میں خود شراب فروشوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ اس کا آغاز

اِس طرح ہوا کہ سیاسی ہنگاموں کے دوران بعض شراب فروشوں نے کاروباری رقابت کے تحت کرائے کے غنڈوں سے ایسی شراب کی دکانوں پر حملے کروا دیئے جو ان کے کاروبار کی ترقی میں حارج تھے۔ بلکہ ایک شخص کے متعلق مشہور ہے کہ شروع شروع میں ایسی کارروائیاں خود اسی کے اشارے پر ہوتی تھیں۔ وہ صدر کے علاقے میں شراب کی دکان کا لائسنس چاہتا تھا مگر بہت دوڑ دھوپ کے باوجود اسے لائسنس نہ ملا۔ بلکہ کسی دوسرے کو مل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہنگاموں کے دوران شراب کی لوٹ مار کی ابتداء اسی دکان سے ہوئی۔ پھر سالہاسال تک ہر سیاسی ہنگامے کے موقع پر یہ دکان توڑ پھوڑ اور لوٹ مار کا نشانہ بنتی رہی۔

ترجمان نے بتایا کہ شراب کی دکانوں پر جب نہ صرف کراچی بلکہ ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی حملہ کرنے کا رجحان بڑھنے لگا تو شراب فروشوں کو تشویش پیدا ہوئی۔ انہوں نے اس کے اسباب پر غور کیا تو یہ اندازہ ہوا کہ اب یہ کاروباری رقابت سے زیادہ ایک سیاسی رجحان بن چکا ہے اور اس کا اظہار صرف اس وقت ہوتا ہے جب جماعتِ اسلامی یا دوسری اسلام پسند جماعتیں کوئی سیاسی ہنگامہ برپا کرتی ہیں چنانچہ بہت سوچ بچار کے بعد جماعتِ اسلامی سے رجوع کیا گیا۔ اس کے ساتھ ایک خفیہ سمجھوتہ کیا گیا۔ اس سمجھوتے کے تحت یہ طے پایا کہ شراب فروشوں کی جانب سے جماعتِ اسلامی کو پانچ لاکھ روپے سالانہ کی رقم اس مقصد کے لیے دی جائے گی کہ وہ شراب کی دکانوں کے لیے ہنگاموں کے دوران تحفظ مہیا کرے گی۔ بعض دکاندار اس پر آمادہ نہ ہوئے مگر شراب کے تمام بڑے ڈیلر اور سول ایجنٹ اس سمجھوتے میں شامل ہوئے۔ جماعتِ اسلامی کو دی جانے والی اس رقم کو ڈیلر "توڑ پھوڑ ٹیکس" کہتے ہیں۔

مگر "توڑ پھوڑ ٹیکس" ادا کرنے کے باوجود شراب کی دکانوں کی توڑ پھوڑ ہوئی تو جماعتِ اسلامی سے استفسار کیا گیا۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ ایسی توڑ پھوڑ میں ان کے کارکنوں کا ہاتھ نہ تھا۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی قبیل کی دوسری سیاسی جماعتوں سے مذاکرات کیے گئے۔ انہوں نے زیادہ رقم نہ مانگی۔ صرف دو لاکھ روپے سالانہ پر ان سے معاملہ طے ہو گیا مگر اس سمجھوتے کے ساتھ ایک نئی پیچ یہ پیدا ہوئی کہ ان کے بعض رہنماؤں نے قیمتی شرابوں کی بھی فرمائشیں شروع کر دیں اور وہ بھی بلا قیمت! مگر جب یہ فرمائش بڑھنے لگی تو پریشانی پیدا ہوئی۔ آخر باہمی گفت و شنید کے بعد ایسی فرمائشوں کا ماہانہ کوٹہ مقرر کر دیا گیا اور قیمت میں پچاس فیصد رعایت کر دی گئی۔

ترجمان نے جماعتِ اسلامی اور دوسروں کے خلاف جو الزامات لگائے ہیں۔ ان کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ یہ تمام باتیں انتظامیہ کے بڑے حکام کے علم میں ہیں اور اگر حکومت اس سلسلے میں تحقیقات کرانا چاہے تو وہ دستاویزی ثبوت فراہم کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔

انہوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ شراب فروشوں نے اس سیاسی رشوت کے علاوہ پچھلے انتخابات میں جماعتِ اسلامی اور دوسری اسلام پسند جماعتوں کی بھرپور مالی امداد کی۔ اور اس دعوے پر کی کہ انتخابات میں کامیابی کے بعد شراب کے کاروبار پر پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔ مگر یہ تمام پاپڑ بیلنے کے باوجود اسلام پسندوں کے سیاسی ہنگاموں کے دوران شراب کی دکانوں پر حملوں کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ کراچی کے حالیہ ہنگاموں کے دوران جس کثرت سے شراب کی دکانیں لوٹی گئیں اور تباہی کا نشانہ بنیں۔ اس صورتِ حال نے شراب فروشوں کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔

درست ہے کہ شراب کی دکانوں کا باقاعدہ انشورنس ہوتا ہے مگر انشورنس کمپنیوں سے تاوان حاصل کرنے میں طویل دوڑ دھوپ کے علاوہ مہینوں اور اکثر برسوں اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے سیاسی رشوت کے علاوہ دوسری قسم کی رشوتیں بھی ہیں جو مختلف سرکاری محکموں کے بڑے افسروں اور دوسرے عملے کو دینی پڑتی ہیں۔ علاوہ ازیں لوٹ مار اور توڑ پھوڑ کے مسلسل واقعات کے بعد سیلز مین اور چوکیدار ملازمت کے لیے نہیں ملتے۔ کچھ چلے گئے اور جو ہیں وہ ہر وقت خوفزدہ اور دہشت زدہ رہتے ہیں لیکن ان تمام مشکلات اور خطرات کے باوجود شراب فروش اپنا کام بند کرنے پر ہرگز آمادہ نہیں۔ اس لیے کہ اس کاروبار میں دوسرے کسی بھی کاروبار کے مقابلہ میں منافع کی شرح بہت زیادہ ہے۔

چنانچہ مشکلات اور خطرات سے بچنے کے لیے شراب کا کاروبار کرنے والے اب نئے نئے طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ دکانوں کے اندر مال زیادہ نہیں رکھا جاتا بلکہ مضبوط گوداموں اور تہ خانوں میں حفاظت کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ دکانوں کو اس طرح ترتیب دیا جا رہا ہے کہ حملے کے وقت فوری طور پر کس طرح زیادہ سے زیادہ مال کو بچایا جا سکتا ہے

علاوہ بریں بعض شراب فروشوں نے دکانوں میں اسٹاک رکھنے کی بجائے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ بیشتر مال صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لیے اسمگل کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس لیے کہ شراب پر پابندی کے بعد وہاں قیمتوں میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں نت نئے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ادویات اور عام مشروبات کی بوتلوں میں مختلف قسم کے لیبل لگا کر مال بردار ٹرکوں کے ذریعے دوسرے سامان کے ساتھ شراب بھی ان صوبوں کو بھیجی جاتی ہے چنانچہ اس سلسلے میں چند روز قبل پشاور میں ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کے ایسے چار ٹرک پکڑے گئے جن میں دوا کی بوتلوں کے اندر شراب بھر کر اسمگل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

غرضیکہ شراب فروشوں کی ایک بڑی تعداد آجکل دکانوں کے بجائے سرحد اور بلوچستان کے لیے شراب اسمگل کرنے کے کاروبار میں زیادہ دلچسپی لے رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شراب فروشوں نے مشترکہ طور پر ایک نیا فنڈ قائم کیا جو ان صوبوں کے بڑے حکام اور بعض سیاسی رہنماؤں کو رشوت دینے کے لیے ہے۔ یہ فنڈ پندرہ لاکھ روپے سالانہ کے لگ بھگ ہے۔ شراب فروشوں کا کہنا ہے کہ جب تک شراب پینے والے ہیں شراب کا کاروبار بند نہیں ہو سکتا شراب پینے والوں کی یہ تعداد کم ہونے کے بجائے ہر سال بڑھتی جا رہی ہے۔ اس میں خوشحال طبقہ کی بہت بڑی اکثریت ہے۔ اور اس میں ہر سیاسی جماعت کے لوگ شامل ہیں خواہ وہ عام جلسوں، اخبارات، ریڈیو اور نشر و اشاعت کے مختلف ذرائع کے ذریعے اپنی پارسائی اور نیکوکاری کا کتنا ہی ڈھنڈورا پیٹیں۔ شراب فروشوں سے ان کا کردار پوشیدہ نہیں۔ وہ انہیں اچھی طرح جانتے ہیں اس لیے کہ وہ ان کے گاہک ہیں۔

بقیہ : لانگ مارچ

گیارہ صوبوں کے تقریباً ۲۰ کروڑ عوام کو بتا دیا ہے کہ سُرخ فوج نے جو راہ اختیار کی ہے، وہ اُن کی آزادی کی واحد راہ ہے۔ لانگ مارچ کے بغیر عوام کو دنیا کی اِس عظیم صداقت کا جس کی سُرخ فوج تجسیم کرتی ہے، اتنی جلدی کیسے علم ہو سکتا تھا؟ لانگ مارچ تخم ریزی کی مشین بھی ہے۔ اُس نے گیارہ صوبوں میں جو بہت سے بیج بوئے ہیں، وہ پھوٹیں گے، ان سے کونپلیں نکلیں گی۔ پھول کھلیں گے اور وہ بارآور ہوں گے اور آئندہ فصل دیں گے۔ مختصر یہ کہ لانگ مارچ ہماری فتح اور دشمن کی شکست پر منتج ہوا۔

لانگ مارچ کی فتح نے چینی انقلاب کو ایک دوسرے بحران سے نکال دیا جو ۱۹۲۷ء کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس نے تمام چینیوں کے حوصلے بلند کر دیئے اور جاپان کے خلاف جنگ مزاحمت میں اپنے مستقبل کے لئے اعتماد پیدا کر دیا۔ اُس نے چینی کمیونسٹ پارٹی اور سُرخ فوج کی کریک فورس کا تحفظ کیا اور کڑی آزمائشوں سے گزر کر پارٹی کی صفوں کو صیقل کیا۔ اِس قوت کی بدولت جاپان کے خلاف جنگ مزاحمت کے دوران پارٹی اور صدر ماؤ کی صحیح قیادت میں انقلابی قوتیں پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو گئیں اور اس طرح اِس عظیم فتح کی بنیاد پڑ گئی جس کے ذریعے چینی عوام نے سامراجیوں اور اُن کے پالتو کتوں، کومنتانگ رجعت پسندوں کے اقتدار کا تختہ الٹا اور ایک نئے چین کی بنیاد ڈالی۔

چوتھی سمت

اللہ کا کام اپنے ذمے
نہ لو، پاکستان کی
فکر کرنے والے
آپ کون ہیں؟

ممتاز مفتی

سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اِس موضوع پر کیوں لکھ رہا ہوں۔ لیکن —— یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ آج تک میں نے اس موضوع پر کیوں نہیں لکھا۔ جب کہ کئی ایک سال سے یہ موضوع میرے کندھوں پر جزیرے کے بڈھے کی طرح سوار ہے۔ جب کہ عرصے سے میں ایک ویران گھر کی مصداق ہوں —— آسیب زدہ گھر۔ آسیب پاکستان ہے ——

میرے لئے پاکستان ایک معمّہ ہے، ایک پُراسرار سایہ ہے پاکستان کے شانے پر کس کا پُراسرار ہاتھ ہے۔ پاکستان کی ناؤ کو کون کھے رہا ہے۔ پاکستان کی باگ کس کے ہاتھ ہے۔ کس کے ہاتھ میں؟ کیوں؟ بیٹھے بٹھاتے میں محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کے ساتھ ایک چوتھی سمت ملحق ہے —— پھر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ میرے دل میں سوال اٹھتا ہے۔ پاکستان کیا ہے؟ اُسے کیا خصوصیت حاصل ہے؟ کیوں خصوصیت حاصل ہے؟ اس کے ساتھ چوتھی سمت کیوں وابستہ ہے؟ —— کیوں؟

میرے کسی سوال کا آج تک جواب نہیں ملا —— دور بہت دور ایک مبہم مسکراہٹ —— اور بس —— خوف کی ہلکی ہلکی لہریں چاروں طرف سے اٹھتی ہیں، میری طرف بڑھتی ہیں —— ایک گرداب بن جاتی ہیں۔ اور میں ڈوبنے لگتا ہوں، ڈوبے جاتا ہوں —— ہاں مجھے پاکستان سے ڈر آتا ہے۔

لیکن —— آخر میں اس موضوع پر کیوں لکھ رہا ہوں، کیسے لکھ رہا ہوں، کیسے لکھ سکتا ہوں، آپ اس موضوع پر لکھ سکتے ہیں جس سے آپ دور کھڑے ہوں، جس کا آپ احاطہ کر سکیں۔ لیکن اگر آپ کسی موضوع میں ڈوب چکے ہیں تو آپ اس پر کیسے لکھ سکتے ہیں۔ کنارے پر کھڑے ہو کر آپ جھیل کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ جھیل میں ڈوب رہے ہیں تو آپ جھیل کو دیکھ نہیں سکتے —— نہیں اس موضوع پر لکھنا میرے بس کا روگ نہیں —— عجز کا احساس مجھے شل کر رہا ہے۔ اگر میں دو ایک جھلکیاں دکھانے میں کامیاب ہو جاؤں، تو بھی بے کار آپ میری بات کو نہیں سنیں گے، اگر سنیں گے، سمجھیں گے، اگر نہیں سمجھیں گے ——

میں نے اپنے قریبی دوستوں سے اس موضوع پر بات کر کے دیکھی ہے۔ وہ بات غور سے سنتے ہیں، اثر سے بھیگ جاتے ہیں لیکن صرف ایک ساعت کے لئے —— دوسری ساعت میں اُن کے پر یوں خشک ہو جاتے ہیں جیسے کبھی بھیگے ہی نہ تھے جیسے انہوں نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ اُن کا رویہ دیکھ کر مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ آپ راز سے پردہ اٹھا سکتے ہیں —— لیکن راز فاش نہیں کر سکتے۔ آپ شمع جلا سکتے ہیں لیکن اندھیرا دور نہیں کر سکتے —— آپ راز سے پردہ اٹھائیں گے نا۔ دیکھنے والے کی آنکھ سے پردہ کون اٹھائے گا —— معلوم ہوتا ہے افشائے راز کو وقت سے تعلق ہے —— کون سا وقت —— کیسا وقت —— وہ وقت کب آئے گا؟ کب؟

چھوڑیئے یہ تحریر بالکل بے کار ہے —— جسے خود کچھ علم نہیں —— جو خود نہیں جانتا وہ بتائے گا کیا، لکھے گا کیا —— جس پر خود بھید آشکار نہیں، وہ کیسے پردہ اٹھائے گا —— عبث ہے یہ تحریر بالکل عبث ہے لیکن —— اس کے باوجود میں اس موضوع پر لکھنے پر مجبور ہوں۔

جس زمانے میں پاکستان کے قیام کے لئے جد و جہد ہو رہی تھی۔ ان دنوں میرے دل میں پاکستان کے لئے کوئی جذبہ نہ تھا نہ مثبت نہ منفی، میرے لئے پاکستان کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مسلمان الگ ملک کیوں مانگ رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مسلمانوں کے اِس مطالبے پر ہندو کیوں چراغ پا ہوتے ہیں۔ حصولِ پاکستان کی جد و جہد میرے لئے ایک ایسا ڈراما تھا جو سامنے —— مگر دُور بہت دُور کھیلا جا رہا تھا۔ اِس ڈرامے کو میرے جذبات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایسے ہی جیسے کسی چیز کو آپ دیکھتے ہیں، اس پر سوچتے ہیں، ذہنی طور پر اُسے سمجھتے بھی ہیں لیکن وہ آپ کی زندگی کا جزو نہیں بنتی۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ میں اسلامی جذبے سے قطعی طور پر کورا تھا۔

اُسی دور کی بات ہے۔ میرا ایک دوست مجید تھا۔ تھا تو مغرب زدہ لیکن قیامِ پاکستان کی جد و جہد میں پیش پیش تھا! ایک روز میں نے مجید سے پوچھا "بھئی سمجھ میں نہیں آتا کہ قیامِ پاکستان کے لئے تم اتنے دُکھی کیوں ہو رہے ہو؟"

مجید ہنسا۔ بولا۔ "ظاہر ہے۔"

میں نے کہا۔ ظاہر تو کچھ بھی نہیں۔"

بولا۔ "بھئی اس لئے کہ میں مسلمان ہوں۔"

اس پر میری ہنسی نکل گئی، میں نے کہا۔ "بھائی میرے نہ تم نماز پڑھتے ہو، نہ روزہ رکھتے ہو۔ نہ تمہارے رہن سہن میں اسلامی جھلک ہے۔ پھر تم مسلمان کیسے ہوئے؟"

مجید نے کہا۔ "اِس طرح کہ اگر میں گھر سے باہر نکلوں، دیکھوں کہ بازار میں ایک ہندو اور ایک مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں، تو میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ بات کیا ہے۔ یہ نہیں سوچوں گا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ یہ قصور کس کا ہے۔ پوچھے بغیر میں ہندو کو پیٹنا شروع کر دوں گا۔ مسلمان ہونے کی یہی تو ایک نشانی ہے۔ اور میں تو بھئی خالی مسلمان ہی نہیں، بلکہ پکا مسلمان ہوں۔ پکا۔"

"کیا مطلب" میں نے پوچھا۔

ایک ساعت کے لئے اُس نے سوچا پھر بولا۔ "مثلاً اگر ابھی اس کمرے کی چھت پھٹ جائے اور اُوپر سے ایک تخت اُتر آئے تخت پر ایک فرشتہ بیٹھا ہو۔ فرشتہ مجھ سے کہے کہ اللہ میاں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ فرمایا ہے کہ جاؤ مجید پر اِس حقیقت کا انکشاف کر دو کہ اسلام سچا مذہب نہیں ہے۔ تو میں فرشتے کو جواب دوں گا کہ اللہ میاں سے میرا سلام کہنا اور عرض کرنا کہ حضور کا پیغام مل گیا۔ شکریہ لیکن مجید مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔"

مجید کی اس بات نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ کئی روز میں گہری سوچ میں پڑا رہا۔ شاید بنیادی طور پر مذہب جذبے ہی کا نام

ہے۔ اس کے باوجود میرے دل میں جذبہ پیدا نہ ہوا ——— نہ اسلام کے لئے نہ پاکستان کے لئے۔

پاکستان کے قیام سے کچھ عرصے پہلے جب چھرا بازی کے واقعات عام ہو گئے تھے۔ میں بمبئی میں مقیم تھا۔ ان تشدد بھرے واقعات کو دیکھ کر مجھے ہندوؤں پر غصہ آنے لگا۔ آخر قیام پاکستان پر وہ اس قدر مشتعل کیوں ہو رہے تھے۔ کیوں تشدد پر تلے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر اور گلیوں میں نہتے راہ گیروں کو خنجر مارنے سے کیا پاکستان کے قیام کو روکا جا سکتا تھا۔ پاکستان میرے قریب آتا جا رہا تھا۔

انہی دنوں بمبئی کی سٹیج پر پاکستان کے قیام کے خلاف کھیل کھیلے جا رہے تھے۔ ان کھیلوں کے روحِ رواں پرتھوی راج تھے۔ پرتھوی راج کو میں ایک عظیم فن کار سمجھتا ہوں۔ اُن دنوں بھی میرے دل میں ان کے لئے بے پناہ عزت تھی۔ ایک روز میں کھیل دیکھنے گیا پیش کش اعلیٰ تھی، اداکاری عمدہ تھی۔ لیکن پروپیگنڈا بھونڈا تھا کھیل ختم ہوا تو تھیٹر کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے۔ تماشائیوں کے باہر نکلنے کے لئے ایک خصوصی راستہ کھولا گیا۔ یہ راستہ ایک تنگ اور گھومتی ہوئی گلی پر مشتمل تھا۔ جس میں صرف ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ اس لئے تماشائی ایک دوسرے کے پیچھے لمبی قطار میں آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ گلی کے ایک فراخ گوشے میں پرتھوی راج تھیٹر والی میک اپ میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کا سر عجز و احترام سے جھکا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دامن کو جھولی بنا کر تھام رکھا تھا۔ جھولی نوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ جس میں چند ایک چیک بھی تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ قیام پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لئے "دان"، مانگ رہا تھا۔ پرتھوی راج کو عجز کی تصویر بنے دیکھ کر میرے دل میں پیار کا ایک ریلا اٹھا۔ لیکن جھولی دیکھ کر غصہ آ گیا۔ کیا یہ شخص توقع رکھتا ہے۔ مجھ جیسے؟ ——— جی چاہا کہ جیب سے ہاتھ نکال کر پرتھوی کو مکا دکھاؤں اور دانت پیس کر کہوں۔ "اتنی جسارت"؟ لیکن طبعاً میں ایک کمزور آدمی ہوں اور محفل کے رنگ سے ہٹ کر بات کرنے سے ہچکچاتا ہوں۔ میرا ہاتھ مکا نہ بن سکا۔ الٹا اس نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر پرتھوی راج کی جھولی میں ڈال دیا۔ اُس رات غصے کی وجہ سے مجھے نیند نہ آئی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے پاکستان کے خلاف چندہ کیوں دیا۔ کیوں۔ میں نے پرتھوی راج کو مکا کیوں نہ دکھایا۔ اس کے بعد جب بھی خبر آتی کہ غنڈے نے راہ گیر مسلمان کے پیٹ میں چھرا بھونک دیا ہے تو میں محسوس کرتا کہ وہ غنڈہ میرے اُن پانچ روپے کے عوض کرائے پر لیا گیا تھا۔ میرے اس پانچ روپے کے نوٹ کی وجہ سے ایک مسلمان کا پیٹ چاک ہو گیا تھا۔ غنڈے کے چھرے کے دستے پر میرا نام کندہ تھا۔

چھرا چلانے کی وارداتیں بڑھتی گئیں۔ نفرت کے جذبات کی وجہ سے میں غنڈوں کی طرف سے پیچھے ہٹتا گیا۔ پاکستان کے قریب اور قریب، بھارت سے میری یہ پسپائی نفرت اور ڈر کی وجہ سے تھی۔ جس میں نفرت کا عنصر غالب تھا اور یہ نفرت کبھی کبھار اتنی شدت اختیار کر لیتی کہ میرا جی چاہتا بھرے بازار میں نعرہ لگاؤں اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد۔

اُس روز احمد بشیر اور میں بمبئی کے ایک ہندو علاقے سے گزر رہے تھے۔ ذاتی طور پر میں کبھی اس علاقے سے گزرنے کی جسارت نہ کرتا۔ مگر میرا ساتھی احمد بشیر طبعاً خطرے میں دوچار ہونے کا دلدادہ تھا۔ وہ پیدائشی پاکستانی تھا۔ ڈر اور خوف سے بے پروا، خطرے کا پروانہ، وہ مجھے زبردستی ایسے مقامات پر لے جاتا تھا۔ دفعتاً ٹریفک رُک گئی۔ چوک میں ہندوؤں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ "سب پیدل چلنے والے بائیں ہاتھ کی پٹڑی پر آ جائیں۔" کسی نے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا۔ تمام لوگ پٹڑی پر اکٹھے ہو گئے۔ اور باری باری کیو میں آگے بڑھنے لگے۔ میں نے گھبرا کر احمد بشیر کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں پھلجڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر تبسم تھا۔ پٹڑی پر ایک میز رکھی تھی۔ ایک آدمی رجسٹر سامنے رکھے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہر راہ گیر رجسٹر پر اپنا نام اور ولدیت لکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ نام لکھنے کا مقصد مسلمانوں کو چھانٹنا ہے۔ آر تھر، میں نے باآوازِ بلند احمد بشیر سے کہا پہلے تو اُس نے حیرت سے میری طرف دیکھا، پھر سمجھ گیا۔ "آرتھر یہ سب کیا ہے؟" میں نے دہرایا۔

"کچھ بھی نہیں مائیکل"۔ اُس نے باآوازِ بلند کہا اور ہنسنے لگا۔ گورنمنٹ کے نام کوئی (Reresentation) بھیجی جا رہی ہے۔ جس پر دستخط کرا رہے ہیں۔ کیوں مسٹر" اُس نے ساتھ کھڑے لالہ جی سے پوچھا۔ "اوکے۔"

جب میں رجسٹر میں دستخط کرنے لگا تو مجھ پر ایک وحشت سی سوار ہو گئی۔ جی چاہا کہ چیخ چیخ کر کہوں میں محمد ممتاز ہوں۔ محمد ممتاز میں مسلمان ہوں، پاکستانی ہوں۔ میرے پیٹ میں چھرا بھونک دو، وہی چھرا جسے ان پانچ روپوں سے خریدا گیا ہے جو میں نے چندے کے طور پر دیئے تھے۔ میں نے پاکستان کیخلاف جرم کیا ہے۔ یہی میری سزا ہے۔ میں نے چیخ چیخ کر اعلان کیا۔ لیکن میرے حلق میں آواز نہ تھی کسی نے میرا اعلان نہ سُنا اور میں نے چپکے سے مائیکل موفنی ولد جان موفنی بقلم خود رجسٹر میں لکھ دیا۔ اور آگے چل پڑا۔

یہ سچ ہے کہ مجھ میں جرأت نہ تھی۔ لیکن پاکستان اور میرے درمیان اب کوئی فاصلہ نہیں رہا تھا۔ پاکستان میرے جذبات میں داخل ہو چکا تھا۔ بظاہر ایک دیوار حائل تھی، جرأت کی دیوار۔

پھر جو میں نے چاروں طرف غور سے دیکھا تو کسی میں بھی جرأت نہ تھی۔ کانگریس مسلمانوں اور دنیا کو دھوکا دے رہی تھی، پرتھوی راج اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ سب جھوٹے تھے۔ صرف دو افراد سچے تھے۔ صرف دو۔ ان میں خلوص تھا۔ وہ پاکستانی جو اللہ اکبر کے نعرے لگاتا تھا اور وہ غنڈا جو مسلمان راہگیر کے پیٹ میں چھرا بھونکتا تھا۔ اور میں بے شک بزدل تھا۔ میرا دل جذبے سے خالی تھا لیکن میں جھوٹا نہ تھا، نہ دوسروں کو فریب دیتا تھا نہ اپنے آپ کو۔

۱۴ اگست، ۱۹۴۷ء کا دن آ گیا۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ پاکستان کے لئے مثبت جذبہ محسوس کیا۔ رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ ہم ریڈیو سیٹ کے پاس بیٹھے تھے۔ ریڈیو پر سگنیچر ٹیون بج رہی تھی۔ دف کی گمک عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ جیسے طبلِ جنگ بج رہا ہو۔ اونچے سُروں میں طوطی للکار رہی تھی۔ لیکن میرے لئے اس سگنیچر ٹیون کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ کسی کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ دفعتاً اعلان ہوا۔ "ریڈیو پاکستان"۔ میرے ہاتھ سے کتاب چھوٹ گئی۔ سارے جسم پر چیونٹے رینگنے لگے۔ دل میں ایک ہوائی سی چھوٹی۔ سارے وجود میں رنگین ستارے ناچنے لگے۔ پاکستان کے لئے یہ پہلا مثبت جذبہ تھا۔ جس نے ان جانے میں میرے بند بند کو جھلا دیا۔ جیسے چودھویں کا چاند سوئے ہوئے سمندر کو چابک مار کر جگا دیتا ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد بمبئی میں شہرت اور امارت کے واضح امکانات مہمل دکھائی دینے لگے۔ ساز و سامان جس کے حصول کے لئے ہم بمبئی گئے تھے، اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔ لہٰذا احمد بشیر اور میں جوں توں پاکستان آ پہنچے۔ یہاں پہنچ کر صرف ایک فکر دامن گیر تھی کہ اپنے عزیز و اقربا کو ضلع گورداسپور سے نکال کر پاکستان لے آئیں۔ پاکستان ہمارے لئے دارالسلام بن گیا تھا۔ پاکستان میں ہمارے لئے مسلمانوں کے لئے سلامتی تھی۔ اب مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں مسلمان ہوں، چاہے میرے دل میں ایمان کی روشنی تھی یا نہیں تھی، چاہے میری زندگی اسلام کے رنگ میں رنگی تھی یا نہیں، چاہے میرے قلب میں اسلامی جذبہ تھا یا نہیں بہرحال میں مسلمان تھا۔

قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کے کیمپوں میں مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ دیکھ کر مشرقی پنجاب میں کشت و خون کے واقعات کے بارے میں سُن سُن کر، بھارت کے رویے کو دیکھ دیکھ کر یہ خیال مستحکم ہوتا گیا کہ پاکستان سے ہماری زندگی اور سلامتی وابستہ ہے۔ لیکن ابھی تک یہ جذبہ خام تھا۔ یہ جذبہ حفظ ماتقدم کے لئے تھا۔ اپنی ذات کے لئے محدود تھا۔ ضرورتِ وقتی کی پیداوار تھا۔ بھارت کے طرزِ عمل کا ردِعمل تھا۔ یہ جذبہ اسلام کی عظمت کا حامل نہ تھا۔ آٹھ سال گذر گئے۔

اس عرصے میں ایک ایسے ادیب سے میری راہ و رسم ہو گئی جو اسلامی جذبے سے سرشار تھے اور جن کی زندگی میں عملی طور پر اسلامی رنگ نمایاں تھا۔ ایک روز میں اُن کے ہاں گیا تو وہاں ایک معمر آدمی خواجہ صاحب بیٹھے تھے۔ ہمارا تعارف ہو گیا۔ اس کے بعد کئی بار خواجہ صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ خواجہ صاحب کم گو تھے۔ اپنی بات کہنے کے بجائے دوسرے کی بات سننے کے عادی تھے۔ ذہین اور باریک بین تھے۔ دوسروں کی مدد کرنے کے

دلدادہ تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ راست گو تھے۔ ایک روز میرے دوست نے مجھ سے کہا کہ خواجہ صاحب اچھے بزرگ ہیں لیکن خواجہ صاحب میں بزرگ کی کوئی خصوصیت دکھائی نہ دیتی تھی۔ میرے نزدیک بزرگ وہ ہوتے ہیں جو جٹا دھاری ہوں۔ جن کی ہر بات سے ذاتی اہمیت مترشح ہوتی ہو جو ڈالش بنا کر بیٹھنے کے عادی ہوں اور پند و نصیحت سے شغف رکھتے ہوں۔ خواجہ صاحب میں کوئی بات بھی تو نہ تھی۔ ان کی گفتگو میں روحانیت کی طرف کوئی اشارہ نہ ہوتا تھا۔ بلکہ عام دنیاوی مسائل پر وہ بڑے زیرک انداز میں دنیاوی نقطہ نظر سے بات کرنے کے عادی تھے۔ اسی وجہ کی بنا پر میں نے خواجہ صاحب سے ملنا جلنا جاری رکھا۔ ورنہ اگر مجھے ذرا بھی شبہ پڑ جاتا کہ وہ بزرگ ہیں اور روحانیت سے تعلق رکھتے ہیں تو میں یقیناً ان سے پیچھے ہٹ جاتا۔ چونکہ مجھے بزرگوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ایک روز میں قبرستان کی طرف جا نکلا دیکھا کہ ایک معمولی سی چار دیواری کے اندر خواجہ صاحب ایک مزار پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ میں رک گیا۔ فارغ ہونے کے بعد خواجہ صاحب حسب دستور بڑے تپاک سے ملے۔

کہنے لگے "کہیئے کیا حال چال ہے۔"

میں نے کہا۔ "جی کوئی خاص اچھا نہیں، بس غم کھا رہے ہیں۔"

بولے "کیوں؟ غم کس بات کا؟"

میں نے کہا۔ "خواجہ صاحب پاکستان کا کیا بنے گا یہ کشتی تو ڈول رہی ہے۔" میں نے یہ بات تفریحاً کہہ دی تھی۔ یہ درست ہے کہ مجھے پاکستان کے ڈولنے کا احساس تھا لیکن پاکستان کے لئے کوئی خاص لگن میں نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

خواجہ صاحب میری بات سُن کر دفعتہً سنجیدہ ہو گئے "مفتی صاحب" وہ بولے۔

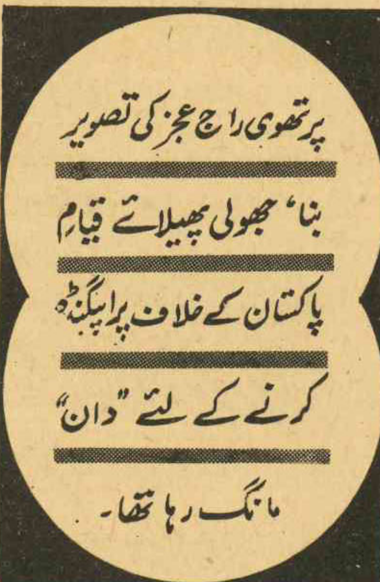
"پاکستان" کا غم آپ کیوں کھاتے ہیں جب پاکستان کا غم کھانے کے لئے بڑی بڑی ہستیاں موجود ہیں۔ آپ کو اور مجھے غم کھانے کی کیا ضرورت ہے۔" ایک ساعت کے لئے وہ رک گئے پھر بولے "اس بڈھے کو دیکھتے ہیں آپ" میں نے اُس جانب دیکھا جدھر خواجہ صاحب اشارہ کر رہے تھے۔ جس پر وہ ابھی ابھی فاتحہ پڑھ کر آئے تھے۔ خواجہ صاحب بولے "اس بڈھے نے اپنی تمام تر زندگی قیام پاکستان کے لئے وقف کر دی تھی۔ یہ بُوٹا اُسی بڈھے کا لگایا ہوا ہے۔"

"مفتی صاحب" وہ مسکرا کر کہنے لگے "پاکستان کیلئے بہت عظیم ہستیاں کام کر رہی ہیں، آپ کیوں غم کھاتے ہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں" میں نے ازراہ مذاق کہا۔

"آپ صرف اتنا کریں کہ ہر کام سے پہلے سوچیں۔ کیا آپ پاکستان کے مفاد کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ آپ کا قدم پاکستان کے مفاد کے خلاف تو نہیں۔ اس میں آپ کا اپنا فائدہ ہے۔ پاکستان تو بہر صورت پھلے پھولے گا۔ اس کی بہار دیکھ کر لوگ عش عش کریں گے۔ انشاءاللہ۔"

خواجہ صاحب کی بات سُن کر مجھے بے حد حیرت ہوئی۔ خواجہ صاحب نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ انہوں نے تو کبھی بڑ نہ ہانکی تھی۔ ان کی بات بڑی زیرک ہوتی جو عملی دنیا سے متعلق ہوتی تھی۔ وہ پیر پرستی کے حق میں نہ تھے۔ پھر وہ بڈھا کون تھا جس نے پاکستان کا بوٹا لگایا تھا وہ بڑی ہستیاں کون تھیں جو پاکستان کا غم کھانے پر مامور تھیں۔ پاکستان میں کیا خصوصیت ہے کہ بڑی ہستیاں اس پر مامور ہوں۔ پاکستان ایک



چھوٹا سا ملک ہے۔ اس میں ابھی تک کوئی اسلامی خصوصیت پیدا نہیں ہوئی اور اسلامی ملک تعداد میں بیسیوں ہیں، سب کی حالت ناگفتہ بہ ہے خواجہ صاحب کی بات مہمل نظر آتی تھی، بات کی طرف توجہ کرتا تو وہ بے معنی معلوم ہوتی۔ خواجہ صاحب کے کردار کی طرف نظر جاتی تو از سر نو کشمکش و پیچ میں پڑ جاتا، خواجہ صاحب کی زیرکی، ان کی راست گوئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

خواجہ صاحب میں ایک عجیب سی خصوصیت تھی۔ جب بھی وہ اللہ کا نام لیتے تو کچھ ایسے انداز میں بات کرتے جیسے اللہ ان کے پاس ہی بیٹھا ہو۔ اور اللہ کا ایک خصوصی پروگرام ہو اور وہ کُن کہہ کر تخلیق کرنے والا اللہ نہ ہو بلکہ ہر لمحے محنت، مشقت اور مزدوری کرنے والا ہو۔ جس کے ہاتھ محنت کرتے کرتے بھدے ہو چکے ہوں اور جو ہر بات میں دوسروں کا ہاتھ بٹانے کا دلدادہ ہو۔ ان کی یہ بات مجھے کھلتی تھی۔ خواجہ صاحب نے اللہ کو مزدور بنا رکھا تھا۔

اللہ کا میں بڑا قائل تھا میرے ذہن میں اللہ کی دو خصوصیات نمایاں تھیں۔ اس کی عظمت اور بے نیازی، اللہ کی عظمت کا احساس فلکیات اور جمادات کے مطالعے سے پیدا ہوا تھا۔ اور اس کی بے نیازی میرا اپنا تاثر تھا۔ میں اِسے رب العالمین سمجھتا تھا رب المسلمین نہیں۔ میرے نزدیک اللہ ایک عظیم شہنشاہ تھا جس کی ریاست سیکولر secular تھی، اسلام میرے نزدیک ایک ضابطۂ عمل تھا جو صرف بنی نوع انسان کے لئے باعث فلاح تھا۔ جس کے لئے اللہ کو اپنے طرز عمل میں رد و بدل گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ میرے اللہ کو افراد سے دلچسپی نہ تھی۔ مذہب کے نقطۂ نظر سے رعایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا پھر پاکستان کی امتیازی حیثیت کے کیا معنے؟ یہ ساری بات ہی بے ہنگم تھی۔ اس کے باوجود چونکہ وہ بات خواجہ صاحب نے کی تھی میرے دل میں گومگو کا عالم پیدا ہو گیا۔ دل میں اک پھانس سی لگ گئی۔

پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یہ پہلا تذکرہ تھا۔

چار سال بیت گئے۔

میرا تبادلہ ہو گیا، اور مجھے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ میرے نئے افسر میں چند ایک خصوصیات نمایاں تھیں۔ وہ بے حد ذہین تھا۔ کم گو تھا۔ اس میں برداشت کا عنصر اس قدر زیادہ تھا کہ، دیکھنے والے کو غصہ آ جاتا اور اس میں ذات کا خیال قطعی طور پر مفقود تھا۔ صاحب نے مجھے بلایا۔ "بولے آپ کام شروع کر دیں۔"

میں نے کہا۔ "یس سر"

"بولے اس صندوقچی میں پچھلے ہفتے کے خطوط ہیں، ان سب خطوط کو غور سے پڑھیں، موضوع کے لحاظ سے کلاسیفائی (classify) کریں اور ایک سمری (summary) بنا دیں۔ جو خط خصوصی توجہ کے قابل ہو اُسے الگ کر دیں۔"

"یس سر" میں نے کہا

"چپراسی صندوقچی لے آئے گا۔" وہ بولے

"آل رائٹ سر۔" میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں نے پہلا خط کھولا۔ لکھا تھا۔ "اے شاہ تو کتنا خوش نصیب ہے کہ تجھے پاکستان کی بادشاہی کی عزت ملی۔"

خط پڑھ کر میں سوچنے لگا عجیب خط ہے۔ دوسرا خط کھولا تو اور بھی حیران ہوا، لکھا تھا۔ "خبردار۔ دیکھ پاکستان میں آٹا مہنگا نہ ہونے دیجیو۔" تیسرے خط میں لکھا تھا۔ "وہ وقت دور نہیں جب پاکستان میں ایسا عالم ہوگا کہ مدینے کے رہنے والے دیکھ کر کہیں گے سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔"

ان خطوط کو دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے یہ خط کیوں لکھے تھے۔ ان کا مقصد کیا تھا۔ بہر طور ایک بات واضح تھی کہ مکتوب الیہ کی توجہ حاصل کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ زیادہ تر خطوں میں لکھنے والوں کے نام بھی مرقوم نہ تھے۔ یہ خط "دعا گو، خادم یا عاجز" پر ختم ہوتے تھے۔ بیشتر خطوط کاغذ کے پرزوں پر لکھے ہوئے تھے۔ تحریر اور انداز بیان دونوں ہی خام تھے۔ اثر ڈالنے کا عنصر مفقود تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لکھنے والوں نے پیسے کیوں خرچ کئے تھے۔

وقت کیوں صرف کیا تھا۔

پھر میں نے ایک طویل خط اٹھایا۔ یہ خط جنوبی ہند کے کسی شہر ملائم سے موصول ہوا تھا۔ لکھنے والا سب جج تھا جو ۲۰ سال پیشتر ایک حادثے کی وجہ سے اپاہج ہو چکا تھا اور گزشتہ بیس برس سے صاحبِ فراش تھا۔ ان بیس برس میں اس کا واحد کام عبادت تھا۔ خط میں تحریر تھا کہ "میں یہ خط تمہارے لئے نہیں لکھ رہا بلکہ پاکستان کے لئے لکھ رہا ہوں۔ جلد ہی پاکستان ایک عظیم مملکت بن جائے گا۔ ایک عظیم فتح حاصل ہوگی اور پھر پاکستان دنیائے اسلام کا ایک عظیم مرکز بن جائے گا۔"

ان خطوط نے مجھے پاگل کر دیا۔ یہ کون سی دنیا تھی۔ یہ کس قسم کے لوگ تھے۔ خط لکھنے سے ان کا مقصد کیا تھا۔ کیا یہ سب مذہبی ہسٹریا کے مریض تھے Fanatics تھے۔ مجذوب تھے یا wish full Thinkers تھے۔ لیکن ان میں کئی ایک خطوط پڑھے لکھے لوگوں کے بھی تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ ان خطوط میں کسی فرد کا تذکرہ نہ ہوتا تھا۔ کسی فرد کی توقیر و تعظیم نہ ملتی تھی۔ یہ خط قصیدہ گوئی سے خالی تھے۔ ان خطوط میں کسی ظلِ الٰہی کو خطاب نہ کیا گیا تھا۔ ان کا موضوع پاکستان تھا۔ پاکستان کی خصوصی عظمت، پاکستان سے رسول اللہؐ کا التفات، پاکستان پر اللہ کی رحمت و برکت۔ ان خطوط کو پڑھ کر میں پاگل ہو گیا۔ مجھ پر ایک عجیب سی دہشت سوار ہو گئی۔ یہ سب کیا ہے۔ یہ لوگ کون ہیں۔ یہ دنیا کون سی دنیا ہے۔ پاکستان کیا ہے، اسے کیا امتیاز حاصل ہے کیوں حاصل ہے۔

طبیعت کے لحاظ سے میں ایک مجذوب واقع ہوا ہوں۔ عام حالات میں مجھ پر کسی واقعے کا اثر نہیں ہوتا لیکن جب اثر ہو جائے تو میں شل ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے اندر لاوا کھولنے لگتا ہے اور پھر گویا آتش فشاں جاگ اٹھتا ہے۔ ان خطوط کو پڑھ کر پہلے تو میں سوچتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا گویا عقل و خرد کے دونوں کنارے ٹوٹ گئے۔ جذبے کا دھارا بہہ نکلا اور میری "میں" ڈگمگانے لگی۔

دو روز میں دیوانوں کی طرح اپنے گھر میں صحرانوردی کرتا رہا۔ [جب] طوفان تھما۔ تو میں پھر سے سوچنے لگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ صاحب [س]ے مل کر کہوں کہ "جناب عالی یہ خط میرے بس کا روگ نہیں، مجھے کوئی [سن]جیدہ کام دیجئے جسے عقل سے تعلق ہو۔"

تیسرے روز میں تیار بیٹھا تھا کہ جب بھی صاحب اکیلے ہوں [م]یں جا کر اُن سے بات کروں، عین اُس وقت صاحب کا چپراسی [آیا]۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہوا اس سے کہہ دیتا ہوں کہ صاحب اکیلے [ہو]ں تو مجھے اطلاع کر دے۔ چپراسی نے آ کر کہا۔ "جی صاحب بلاتے ہیں۔"

صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے وقت میں نے سوچا کہ صاحب [با]ت کر لیں تو پھر میں اپنی درخواست پیش کر دوں گا۔

اس وقت صاحب کچھ لکھنے میں مصروف تھے، انہوں نے مجھے [دیکھ] کر کہا۔ "آپ گیٹ پر سیکورٹی کے کمرے میں چلے جائیں۔ وہاں ایک [آدمی] مجھ سے ملنے کے لئے مصر ہے۔ آپ اس سے بات کریں کہیں کہ میں نے آپ کو بھیجا ہے۔ اگر وہ آپ سے بات کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس سے بات پوچھ لیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر وہ مجھ سے ملنے پر مُصر رہے تو اُسے جانے نہ دیں، بلکہ مجھے اطلاع دیں۔ میں اس سے ملوں گا۔"

"یس سر"۔ صاحب کی بات سُن کر میں دروازے کی طرف مڑا۔

"اور دیکھئے" صاحب بولے "سیکورٹی کے کمرے میں بات نہ کریں اسے باہر لے جائیں، علیحدگی میں۔ سمجھے۔"

"یس سر"۔ اس وقت صاحب سے اپنی بات کرنے کا موقع نہ تھا میں نے سوچا واپسی پر بات کروں گا۔

سیکورٹی کے کمرے میں ایک دہقان قسم کا آدمی کھڑا تھا۔ میں اُسے باہر باغیچے میں لے گیا۔ "صاحب کام میں مصروف ہیں۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔ اگر آپ یہ بتا دیں کہ آپ انہیں کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں تو۔"

میں ابھی جملہ بھی ختم نہ کر پایا تھا کہ وہ بولا۔ "بابو جی میں نے صاحب سے مل کر کیا لینا ہے۔ مجھے تو اس سے کوئی کام نہیں۔ میں اپنے گاؤں سے آ رہا تھا۔ اس سڑک کے پاس مجھے ایک سانڈھنی سوار ملا۔ اُس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں پاس گیا تو وہ کہنے لگا میاں اس مکان کے اندر جاؤ۔ صاحب سے ملو اور ہمارا ایک پیغام اُسے دے دو۔ سانڈھنی سوار بزرگ آدمی تھا۔ میں نے اس کی بات مان لی اور ادھر آ گیا۔ لیکن یہ پولیس والے دوسرے کی بات ہی نہیں سنتے۔ اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ پیغام مجھے دے دیں۔ میں صاحب تک پہنچا دوں گا۔"

"سانڈھنی سوار نے مجھ سے کہا تھا۔" وہ بولا "جا کر اس سے کہہ دو کہ جو کاغذ وہ لکھ رہا ہے۔ وہ غلط ہے اور جو لکھ کر وہ پھاڑ چکا ہے وہ صحیح ہے۔"

عجیب مہمل سا پیغام ہے میں نے سوچا، نہ سر نہ پاؤں۔ سانڈھنی سوار کو صاحب کے نوٹ سے کیا واسطہ، اور پھر سانڈھنی سوار یہاں کہاں میں نے تو کبھی اس علاقے میں کوئی سانڈھنی سوار نہیں دیکھا۔ یقیناً یہ دہقان پاگل ہے۔

مجھے یقین تھا کہ صاحب بات سُن کر مسکرا دیں گے اور پھر کام میں مصروف ہو جائیں گے لیکن ایک ساعت کے لئے وہ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر نہایت سنجیدگی سے بولے۔ "ذرا یہ ویسٹ پیپر باسکٹ تو اٹھائیے۔" میں نے ٹوکری اٹھا کر میز پر رکھ دی۔ وہ بڑی توجہ اور احتیاط سے کاغذ کے ٹکڑے ٹوکری میں سے چُننے لگے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت سی ہوئی۔ کیا صاحب سانڈھنی سوار کی بات سچ مان بیٹھے ہیں۔

صاحب نے وہ پُرزے میری جانب بڑھا دیئے۔ بولے۔ "اگر آپ کو فرصت ہو تو ذرا انہیں جوڑ دیجئے۔"

"یس سر"۔ میں نے کہا۔

صاحب نے وہ نوٹ اٹھا لیا جو وہ لکھ رہے تھے اور اُسے پھاڑ کر ٹوکری میں ڈال دیا۔ حیرت سے میرا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہ شخص جو اس قدر ذہین اور زیرک ہے کہ ہم ابھی بات کرنے کے لئے مُنہ کھولتے ہیں تو ہمارا عندیہ بھانپ جاتا ہے۔ یہ شخص جو ہر ایک کی بات سننے کے باوجود اپنی رائے رکھتا ہے۔ جس کے خیالات میں انفرادیت اور ندرت ہے جو پٹے ہوئے رسمی خیالات سے دور رہتا ہے۔ جسے Fanaticism سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ شخص ایک مبہم سانڈھنی سوار کی بات کو یُوں اپنا رہا ہے جیسے ہمیشہ ہی سے اُسے ایسے سانڈھنی سواروں سے واسطہ رہا ہو۔ جیسے اس قسم کے پیغامات سے مانوس ہو۔ یہ کیا بھید ہے۔

میں نے کاغذ کے پُرزے جوڑے۔ وہ نوٹ پاکستان کے مجوزہ آئین کی ایک اہم شق تھی جسے اسلام سے تعلق تھا۔

اس کے بعد صاحب سے خطوں کی بات کرنا بے معنی نظر آنے لگا۔ اور میں از سرِ نو ان خطوں کی الف لیلہ میں کھو گیا۔ وہ خط روز موصول ہوتے تھے۔ جگہ جگہ سے موصول ہوتے تھے لیکن عام طور سے ان کا موضوع ایک ہی ہوتا۔ پاکستان، پاکستان کا امتیاز، پاکستان کی آنے والی عظمت، درخشندہ مستقبل، آہستہ آہستہ میں اس طوفان میں بہہ گیا۔ میرے دل میں شکوک پیدا ہونے لگے۔ شاید یہ چوتھی سمت بھی حقیقت ہو۔ شاید اللہ میاں کسی ملک یا فرد میں خصوصی دل چسپی لینے سے گریز نہ کرتے ہوں۔ آخر وہ مالکِ ارض و سما ہیں، اگر وہ بات کرنا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔

ایک روز صاحب نے مجھے بلایا اور ایک کام دے کر اپنے ہی کمرے میں بٹھا لیا تاکہ وہیں بیٹھ کر ختم کر دوں۔ میں ایک کونے میں بیٹھ کر کام کر رہا تھا کہ چپراسی آیا صاحب سے کہنے لگا۔ "سر میرا ایک چچا اب کی بار حج کرنے گیا تھا۔ وہ مدینے شریف سے آپ کے لئے ایک پیغام لایا ہے، حکم ہو تو اُسے بلاؤں۔"

صاحب نے بڑی سنجیدگی سے چپراسی کی بات سُنی بولے۔ "بلا لو"

انہوں نے اپنا کام ایک طرف رکھ دیا۔ اُٹھ کر بڈھے سے مصافحہ کیا اور بڑے غور اور احترام سے بڈھے کی بات سُننے لگے

تمہید کے بعد بڈھے نے کہا۔ "جناب وہ جہلم کے رہنے والے ہیں۔ فوج میں سپاہی تھے۔ بڑی جنگ میں لام پر گئے تھے۔ وہاں سے مدینے شریف میں سلام کے لئے حاضر ہوئے۔ بس وہیں بیٹھ گئے۔ آج تک وہیں بیٹھے ہیں۔ اب وہ چابی بردار ہیں۔ یہ بہت بڑا عہدہ ہے جناب۔"

صاحب نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

بڈھے نے بات شروع کی۔ انہوں نے فرمایا کہ ۱۹۴۶ء میں ہم نے خواب دیکھا۔ دیکھا کہ مسجدِ نبوی سے ایک بیل پھوٹی اور بڑھتے بڑھتے دور نکل گئی۔ اور اس کے پورے سرے پر سبز پتیاں نکل آئیں۔"

صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"چار ایک سال کے بعد خواب میں پھر اسی بیل کو دیکھا۔ شاخ

'وہ مدینے کے چابی بردار ہیں - یہ بہت بڑا عہدہ ہے'

جوُں کی توں قائم تھی لیکن پتیاں مرجھا گئی تھیں۔ اب پھر خواب میں ہم نے وہی بیل دیکھی ہے۔ وہ پھر سے سرسبز ہو رہی ہے۔ پھر سے کونپلیں نکل رہی ہیں۔" انہوں نے فرمایا تھا "ہماری طرف سے جا کر مبارک باد دینا اور ہمارا پیغام دینا، کہنا۔ بھیڑوں کے رکھوالے خود سائے میں نہیں بیٹھتے۔"

جب تک وہ بڈھا باتیں کرتا رہا کوشش کے باوجود میں اپنے کام کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ جب اُس نے کہا "ہماری طرف سے مبارکباد دینا" تو میں نے محسوس کیا جیسے مجھے مبارک باد دی جا رہی ہو۔ اُس روز مجھے پاکستان کا ہر بوٹا مزید ہرا بھرا نظر آنے لگا اور ہر سوکھی شاخ سے نئی کونپلیں پھوٹتی نظر آنے لگیں۔ لاکھ لاحول پڑھتا، اپنے آپ کو قائم کرنے کی کوشش کرتا لیکن بے سود۔ الف لیلیٰ کی اس دنیا میں ایک عجیب کیفیت تھی۔ عجب نشہ تھا۔ میری عقل مجھے ملامت کرتی لیکن مجھے اس نشے کی لت پڑ رہی تھی۔ پھر اللہ میاں میرے رُوبرُو ایک اسٹوُل پر آبیٹھے۔ اِن کے ہاتھوں میں اوزار تھے وہ کام میں منہمک تھے۔ محنت کے پسینے سے شرابور تھے۔ ان کے ہاتھ کام کرتے کرتے بھدے ہو گئے تھے۔ وہ تعمیر میں منہمک تھے۔ پاکستان کی تعمیر۔ یہ میرے اللہ میاں تو نہ تھے۔ یہ تو خواجہ صاحب کے اللہ میاں تھے۔ میرے اللہ میاں جو دُور بہت دور، اُوپر بہت اُوپر تخت پر بیٹھ کر کُن کہا کرتے تھے۔ جو عظیم تھے، بے نیاز تھے، دُور تھے، اونچے تھے، وہ اللہ میاں پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے۔

اِس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جسے دیکھ کر میرا بند بند لرز گیا۔ خوف سے میری گھگھی بندھ گئی۔ صاحب کے ایک دوست نے فون کر کے انہیں بلایا۔ کہنے لگے: "ایک درویش آئے ہیں پہلے یہ حیدر آباد میں آئی جی پولیس تھے پھر بلاوا آگیا۔ سب کچھ چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ بڑے دلِ چسپ آدمی ہیں۔"

صاحب درویش سے ملنے جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ اِس درویش کی شکل بڑی ڈراؤنی تھی۔ سیاہ رنگ، ہڈیوں کا ڈھانچا، خوفناک آنکھیں، کرخت آواز۔ صاحب کا تعارف کرانے کے بعد صاحبِ خانہ کسی کام سے باہر چلے گئے اور صاحب اور وُہ درویش جو مجھے سڑی ہوئی مرچ دکھائی دے رہا تھا اکیلے رہ گئے۔ میں ملحقہ کمرے میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ اخبار پڑھ رہا تھا۔

دفعتہً اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ ملحقہ کمرے میں مرچ انگریزی بول رہا تھا۔ کہہ رہا تھا Flay you alive Put Bran on you and place you in the sun ارے یہ کیا صاحب سے کہہ رہا تھا۔ یہ درویش تھا یا قصائی تھا۔

"میں یہاں صرف اس مقصد کے لئے آیا ہوں"۔ اس کی کرخت آواز پھر گونجی "کہ تمہیں وارننگ دوُں۔ تمہیں پتہ ہے کہ اس سلسلے میں وارننگ نہیں دی جاتی جو کوتاہی کرے اُسے ہٹا دیا جاتا ہے۔ رد کر دیا جاتا ہے۔ لیکن پاکستان کو خصوصی رعایت حاصل ہے۔ اِس لئے وارننگ دی جا رہی ہے۔ اگر اب بھی کوتاہی ہوئی تو کھال اُدھیڑ دی جائے گی اور نمک لگا کر دھوُپ میں رکھ دیا جائے گا۔"

اتنی بات سُن کر خوف سے میرا خوُن جم گیا اور میں دیوانہ وار باہر نکل گیا۔ تین گھنٹے صاحب اور مرچ اِس کمرے میں بند رہے۔

جب صاحب باہر نکلے تو اُن کا مُنہ زرد تھا جیسے تمام خوُن چوُس لیا گیا ہو۔ وہ بصد مُشکل چل رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اُن کی ہڈی ہڈی ٹوُٹ گئی ہو۔

دو سال بعد ایسی ہی نوعیت کا ایک اور واقعہ ہوا صاحب اور میں دورے پر کراچی گئے ہوئے تھے۔ ایک شام ہم سنٹرل جیل گئے۔ صاحب کو وہاں کچھ کام تھا، ابھی وہ کام سے فارغ ہوتے ہی تھے کہ جیل کے ایک گارڈ نے آکر سلوٹ مارا اور بولا۔ "حضور، ایک قیدی آپ کا نام لے لے کر پکار رہا ہے۔ کہتا ہے اُسے بلاؤ۔"

ہم اس گارڈ کے پیچھے چل پڑے۔ ایک چھوٹے سلاخ دار کمرے میں ایک ہیجڑا بند تھا۔ صاحب نے ایک نظر اُس کی طرف دیکھا "تالا کھولو" صاحب بولے "تم جاؤ"۔ گارڈ چلا گیا۔ میں اوٹ میں کھڑا رہا۔ ہیجڑے نے صاحب کو دیکھتے ہی چلّا کر غصے میں کہا "تجھے سیدھا کرنے کے لئے ہمیں قید ہونا پڑا۔"

یہ سُنتے ہی مجھ پر خوف طاری ہو گیا اور میں وہاں سے بھاگا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب صاحب وہاں سے نکلے تو اُن کی وہی حالت تھی جیسے مرچ سے ملاقات کرنے کے بعد ہوئی تھی۔ یا اللہ یہ کیا اسرار ہے۔ میرے ذہن میں پھر سے ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اگلے روز میں اکیلا جیل پہنچا لیکن وہ قیدی وہاں نہیں تھا میں نے اِدھر اُدھر سے اُس کے کوائف پوُچھے پتہ چلا کہ وہ باقاعدہ قیدی نہ تھا۔ جیل کے قریبی بازار میں دنگا کر رہا تھا کہ جیل کے ایک گارڈ نے لا کر اِس کمرے میں بند کر دیا تھا۔ صاحب کے جانے کے بعد اس کے کمرے کو مقفل کر دیا گیا تھا۔ کسی گارڈ کو علم نہ تھا کہ کس نے اُسے رہا کیا ہے۔

اِن واقعات نے مجھے پاگل کر دیا۔ پاکستان کی امتیازی حیثیت کا بھید اور بھی پُراسرار ہو گیا۔ لیکن ان جانے میں مجھے پاکستان کی امتیازی حیثیت کا یقین ہو گیا۔ چوتھی سمت کی بات میرے لئے عجوبہ نہ رہی اور اللہ میاں اپنے مشقت زدہ ہاتھوں سے پاکستان میں جگہ جگہ اینٹیں رکھتے ہوئے نظر آنے لگے۔

پھر میرا تبادلہ ہو گیا اور میری خدمات ایک اور محکمے کو پیش کر دی گئیں۔ اِس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ گاہے گاہے بیٹھے بٹھائے مجھے وہ دورہ یاد آجاتا۔ میرے جسم پر چیونٹے سے رینگتے اور ایک عجیب کیفیت مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ سانپ گزر چکا تھا لیکن لکیریں باقی تھیں اور وہ لکیریں روز بروز روشن تر ہوتی جا رہی تھیں۔ ان لکیروں نے گویا زبردستی میرا زاویۂ نگاہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اِس کے باوجود ذہنی طور پر میں کچھ بھی نہ سمجھ پایا تھا میری کیفیت اُس کتے کی سی تھی جو نہ گھر کا رہا تھا نہ گھاٹ کا۔ پھر بھی پاکستان کے لئے میرے دل میں ایک عقیدت سی پیدا ہو چکی تھی۔ میں پاکستانی ہونے پر ناز محسوس کرنے لگا تھا اور پاکستان کے مستقبل کی طرف نگاہیں اٹھائے انتظار کر رہا تھا، کس کا انتظار۔ یہ مجھے علم نہیں۔ کسی زمانے میں ڈاکٹر لاب سینگ ریمپا سے متعارف ہوا۔

لاب سینگ ایک تبتی راہب لاما ہے۔ جسے تبت میں خصوصی طویل اور کٹھن تعلیم و تربیت دی گئی تھی۔ تبت کے بڑوں کو علم تھا کہ فلاں سن میں تبت پر چین کا تسلط ہو جائے گا۔ لہٰذا انہوں نے بیس تیس سال پیشتر تبتی علوم کے تحفظ کے لئے لاب سینگ کو خصوصی تربیت دی۔ لاب سینگ اِس وقت کینیڈا میں مقیم ہے اِس کی یہ انوکھی رُوئیداد چھ جلدوں میں مرقوم ہے جس میں چوتھی سمت کا تذکرہ عام ہے۔ لاب سینگ کا کہنا ہے کہ یہ چوتھی سمت مادی دنیا سے ہٹ کر نہیں بلکہ اسی کا ایک حصہ ہے اور اس پر بھی مادی اصُول حاوی ہیں۔ چھٹی جلد میں لاب سینگ نے اسباق درج کئے ہیں جن میں سہل مشقیں لکھی ہیں جن کی مدد سے ہم چوتھی سمت سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

اگرچہ لاب سینگ نے میرے سامنے ایک نئی راہ کھول دی پھر بھی پاکستان کی امتیازی حیثیت کا عقدہ حل نہ ہوا۔

ایک روز جب میں اسلام آباد کے گرد و نواح میں گھوم رہا تھا ایک ٹیکسی میرے قریب آکر رُک گئی۔ میرے ایک پُرانے دوست احمد نے ٹیکسی سے سر نکالا۔ اُسے دیکھ کر میں چلایا۔ "ارے تُم تو یورپ گئے ہوئے تھے۔"

"میں اِسی ہفتے واپس آیا ہوں۔" احمد بولا۔

"یہاں کیسے گھوم رہے ہو۔" میں نے پوُچھا۔

"بری شاہ لطیف جا رہا ہوں۔" وہ بولا

احمد کی زبان سے شاہ لطیف کا نام سُن کر مجھے حیرت ہوئی۔ چونکہ احمد تہذیبِ جدید کی پیداوار تھا۔ "تم وہاں جا کر کیا کرو گے۔" میں نے پوُچھا۔

"آؤ یار" وہ بولا، "میرے ساتھ چلو۔ ابھی واپس آجائیں گے۔"

جب ہم مزار میں پہنچے تو فاتحہ خوانی کے بعد احمد بولا "یار بڑی حیرت کی بات ہے۔ کیا یہ لوگ اِس قدر صاحبِ نظر ہوتے تھے۔ — ڈاکٹریٹ کے سلسلے میں یورپ کی متعدد لائبریریوں میں

گیا۔ وہاں ایک نسخہ ملا جس میں درج تھا کہ شاہ لطیف نے نہ جانے کتنے سو سال پہلے فرمایا تھا کہ ہمارے نزدیک ایک اسلامی شہر آباد ہوگا جو دنیائے اسلام کا مرکز بنے گا۔ اور یہ نسخہ دو ڈھائی سو سال پرانا تھا۔ دیکھ لو اسلام آباد نور پور سے ایک آدھ میل کے فاصلے پر ہے۔ صرف آدھ میل حد ہوگئی ہے۔"

جب ہم نور پور سے واپس آرہے تھے تو ٹیکسی رک گئی۔

"کیوں بھائی رک کیوں گئے۔" احمد نے پوچھا۔

"ڈرائیور بولا۔ "جناب نور پور کی سڑک یہاں سے توڑ دی گئی ہے۔" ہم نے باہر دیکھا۔ سڑک ٹوٹی ہوئی تھی۔ دس پندرہ گز کا ٹکڑا اکھڑا ہوا تھا۔ احمد نے قہقہہ لگایا۔ "بولا دیکھ لو مفتی اسلام آباد نے سب سے پہلا یہ کام کیا ہے کہ بری شاہ لطیف کو جانے والی سڑک کاٹ دی ہے۔ اور یہ شہر دنیائے اسلام کا مرکز بننے والا ہے۔" اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

"نور پور کے تانگے کو اسلام آباد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔" ڈرائیور نے کہا۔

"سنتے ہو۔" احمد پھر ہنسنے لگا۔

پھر جنگ چھڑ گئی۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا عجیب و غریب نوعیت کی خبریں آنے لگیں۔ یہ خبریں مافوق الفطرت عنصر سے بھری ہوئی تھیں۔ قدم قدم پر معجزات کے تذکرے تھے۔ اخباروں کے کالم ایسے بیانات سے بھرے ہوئے تھے۔ لوگ ان خبروں کو سنتے اور سر دھنتے۔

حضور اعلیٰ سرور دو عالم عجلت میں گھوڑے پر سوار ہو کر پاکستان کے جہاد میں شامل ہونے کے لئے تشریف لا رہے تھے۔ جنگ بدر کے شہدار محاذوں پر پہنچ چکے تھے۔ حضرت علیؓ، امام حسنؓ اور امام حسینؓ سفید ملبوسات پہنے سیالکوٹ کے قرب و جوار میں محاذ کی طرف جاتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ ایک محاذ کے بھارتی قیدی کا بیان تھا کہ سفید پیراہن والی پاکستانی فوج بھارتیوں کو تہس نہس کر رہی تھی۔ ان کی تلواروں سے شعلے نکل رہے تھے۔ دوسرے محاذ کے قیدی کا بیان تھا کہ سرخ ٹوپیوں اور چھوٹے قد والی پاکستانی فوج نے بھارتی سینا کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ "بھارتی توپچی نے کہا۔ "گولے پھینکنا بیکار تھا۔ ایک سفید ریش بڈھا میرے گولے کیچ کر کے پرے پھینک دیتا تھا۔" بھارتی ہوابازوں کا بیان تھا کہ "جب وہ گولے پھینکتے تھے تو سفید ریش بڈھے انہیں ہاتھوں میں پکڑ کر زمین پر یوں رکھ دیتے کہ وہ پھٹتے نہ تھے۔"

سارا پاکستان ان معجزوں کے تذکروں سے گونج رہا تھا۔

ایک دانشور نے تحقیر بھرا قہقہہ لگایا۔ "یار یہ پاکستانی عوام معجزے گھڑنے میں کمال رکھتے ہیں۔" وہ بولا۔ "آج کل ایسا ایسا معجزہ ایجاد ہو رہا ہے جس کا جواب نہیں۔"

"لیکن" دوسرا بولا۔ "یار اگر ان معجزوں سے ہٹ کر حقائق کی روشنی میں بات سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بات نہیں بنتی۔" "کیا مطلب؟" تیسرے نے کہا۔ "مطلب یہ کہ اگر حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمیں جنگ ہار جانی چاہیئے تھی اور بھارت کو پاکستان پر قابض ہو جانا چاہیئے۔"

"ہاں" ایک اور دانشور بولے۔ "بھارتی حملے کا پلان فوجی اصول کے لحاظ سے عین پریکٹیکل تھا۔ اس میں کوئی سقم نہ تھا۔"

"لیکن یہ مافوق الفطرت داستانیں چھوڑو یار" ایک نے کہا۔ "خالص جدت طرازی۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

"لیکن یار" ایک رپورٹر بولا۔ "دو ایک باتیں میں نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں۔" "دو ایک باتیں ہر کسی نے اپنی آنکھ سے دیکھی ہیں" پہلے دانشور نے تضحیک بھرا قہقہہ لگایا۔

میں ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا لیکن مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ ان سب کے دلوں میں ایک "ضد" لیکن اُبھرتا ہے اور وہ اسے بھولنے کے لئے قہقہوں کا سہارا لے رہے ہیں۔

جنگ نے پاکستان کے معمے کو از سر نو میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ لیکن اب مجھ میں (Resistance) کی طاقت نہ رہی تھی۔ اب مجھ میں اس بات کو شدت سے رد کرنے کی ہمت نہ رہی تھی جسے میں اپنی عقل و خرد کے مطابق سمجھ نہیں سکتا تھا۔ جنگ کے دوران ان محیر العقول باتوں نے پاکستان کی امتیازی حیثیت پر مہر لگا دی تھی اب میرا اللہ سٹول پر بیٹھ کر اینٹیں نہیں رکھ رہا تھا۔ وہ سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی زنگ آلود تلوار تھی، وہ پاکستان کے محاذوں پر گشت کر رہا تھا۔ اور اس کا چہرہ خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔

جنگ کے دوران میرا ایک ہم کار مجھ سے ملنے آیا۔ ملاقات کے بعد میں نے پوچھا۔ "کیا گھر جاؤ گے۔"

بولا۔ "نہیں۔ قاضی صاحب سے مل کر گھر جاؤں گا۔"

میں نے پوچھا "وہ کون ہیں؟"

بولا "وہ ایک عابد آدمی ہیں بہت اچھے لوگ ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجھے بھی لے چلو۔"

قاضی صاحب کے کمرے میں جابجا مکے مدینے کی تصاویر آویزاں تھیں۔ جائے نماز پر تسبیحیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ہمیں بڑے اخلاق سے ملے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھ سے بولے "آپ بھی کوئی بات کریں۔"

میں نے کہا۔ "جی پاکستان کے لئے دعا فرمائیں۔"

دفعتہً وہ سنجیدہ ہو گئے۔ بولے۔ "میں تو بہت چھوٹا آدمی ہوں، بہت چھوٹا آدمی ہوں، میری کیا حیثیت کہ میں پاکستان کے لئے دعا کروں۔ نہیں مفتی صاحب میں اتنی حیثیت کا مالک نہیں۔"

میں نے کہا۔ "جناب قاضی صاحب دعا تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔"

وہ بولے "ٹھیک ہے لیکن پاکستان کی اور بات ہے۔ آپ کو پتہ نہیں مجھے بھی تھوڑی سی خبر ہے، بہت تھوڑی، میں چھوٹا آدمی ہوں بہت چھوٹا۔ پاکستان پر بڑوں کا ہاتھ ہے۔ بہت بڑے جو ہیں اُن کا وہ پاکستان کے محافظ ہیں، اس کے نگہبان ہیں۔ آپ پاکستان کی فکر نہ کریں۔" قاضی صاحب کی بات نے سوئی ہوئی بھڑوں کے چھتے کو پھر سے چھیڑ دیا۔

یا اللہ یہ بڑے کون ہیں۔ کیا وہی ہیں جو جہاد میں شامل ہونے کے لئے عجلت سے گھوڑے پر سوار ہو رہے تھے۔ کیا وہی ہیں جو سیالکوٹ کے گرد و نواح میں سفید پیراہن پہنے دیکھے گئے تھے۔

کیا یہ وہی تھے جو بھارتی توپچیوں کے گولے کیچ کرتے تھے۔ ہوائی جہازوں سے گرائے ہوئے بموں کو اٹھا اٹھا کر دور پھینکتے تھے۔ کیا انہی بڑوں میں سے کسی نے بھارتی پائلٹ کی نظر بند کر دی تھی اور اُسے دریائے راوی پر چھ پل نظر آنے لگے تھے۔ کیا انہوں نے ہی بھارتی پائلٹ کو حکم دیا تھا "بیل آؤٹ بیل آؤٹ" اور وہ پاکستانی مزاحمت کے بغیر بڑوں کی آوازیں سن سن کر گھبرا کر بیل آؤٹ کر گیا تھا کیا پاکستان کے لیڈروں کو اس بات کا شعور تھا کہ بڑے قدم قدم پر پاکستان کی امداد کر رہے ہیں۔ کیا انہوں نے کبھی یہ سوچا تھا کہ پاکستان کی مثالی ترقی میں ہماری جدوجہد کو ان نتائج سے کیا مناسبت ہے جو بظاہر ہماری کوششیں پیدا کر رہی ہیں۔ کیا انہیں اس حقیقت کا شعور ہے کہ بین الاقوامی سطح پر جو مقام پاکستان کو حاصل ہوا ہے۔ وہ کس کا مرہونِ منت ہے۔ کیا پاکستان کے سربراہوں کو کبھی شک پڑا ہے کہ پاکستان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور کیا انہوں نے اس بات کی عملی کوشش کی ہے کہ پاکستان کی کشتی کو کھے کر اس امتیازی حیثیت کی طرف لے جائیں۔ کیا انہوں نے ان بڑوں سے رابطہ پیدا کرنے کی خواہش محسوس کی ہے جو پاکستان کی فلاح و بہبود اور اس کے تحفظ کے لئے پیہم مصروفِ عمل ہیں۔

ہاں۔ قاضی صاحب کی بات نے سوئی ہوئی بھڑوں کے چھتے کو پھر سے چھیڑ دیا تھا۔

جنگ ختم ہوگئی لیکن بھڑوں کا چھتا ابھی تک بھن بھن کر رہا تھا۔ پھر سے جنگ ہونے کا خدشہ لگا ہوا تھا۔ قبرستان کے قریب ایک ننگ دھڑنگ مست اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ "ابھی کیا ہے۔ ابھی تو خون کی ندیاں چلیں گی۔ بہت مریں گے بہت، لاشیں ہی لاشیں، پھر بڑی فتح ہوگی۔ اور پھر سبحان اللہ، سبحان اللہ۔" وہ جوش میں تالیاں بجا رہا تھا، جیسے مجھے چڑا رہا ہو۔

خواجہ صاحب کو مزار پر فاتحہ پڑھتے ہوئے دیکھ کر میں رک گیا۔

"کیا حال ہے مفتی صاحب۔" وہ بولے۔

"فکر میں گھل رہا ہوں۔ خواجہ صاحب۔" میں نے کہا۔

"کس کی فکر میں گھلنے لگے؟" انہوں نے پوچھا۔

"پاکستان کی فکر لگی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ سنجیدہ ہو گئے۔ ان کے چہرے پر غصے کے اثرات تھے بولے "مفتی جی اللہ کا کام اللہ کے لئے چھوڑ دو۔ اللہ کا کام اپنے ذمے نہ لو۔ پاکستان کی فکر کرنے والے آپ کون ہیں جی۔ آپ اپنی سوچئے اپنی فکر کھائیے۔ واہ مفتی جی اتنی سی بات آج تک نہیں سمجھ سکے۔"

— • —

مصر اور لیبیا کا ادغام

امریکہ، روس اور اسرائیل کے خلاف متحدہ محاذ

وھاب صدّیقی



انور سادات



کرنل قذافی

مشرقِ وسطیٰ کے سیاسی افق پر نت نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں، ابھی صدر انور سادات کا ۱۸ جولائی والا بیان جس میں انہوں نے مصر میں مقیم روسی فوجی ماہرین کے اخراج کا اعلان کیا تھا، موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ سیاسی مبصرین اس کی تشریح میں مصروف ہیں کہ ۲ اگست کو لیبیا اور مصر کے ادغام کے منصوبے پر سمجھوتہ ہو گیا

مڈل ایسٹ نیوز ایجنسی کے مطابق بن غازی میں مصر کے انور سادات اور لیبیا کے کرنل معمر قذافی نے "عرب سوشلسٹ جمہوریہ" کا منصوبہ پیش کیا۔ ابتدائی مذاکرات لیبیا کے شہر تبروک میں ہوئے۔ مصر اور لیبیا کے سیاسی ماہرین نے آپس میں تبادلہ خیال کیا۔ اس کے بعد بن غازی میں مذاکرات ہوئے۔ صدر انور سادات نے مذاکرات کے موقع پر اپنے ممتاز ماہرین کو قاہرہ سے طلب کیا۔ آخر کار دونوں فریق مصر اور لیبیا کے ادغام پر رضامند ہو گئے۔ قاہرہ ریڈیو کے مطابق بن غازی مذاکرات میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ

- مصر اور لیبیا کو ضم کر کے ایک سوشلسٹ ملک بنایا جائے گا۔ جس کا نام "عرب سوشلسٹ جمہوریہ" ہو گا۔
- اس نئی ریاست کا ایک صدر ایک پارلیمنٹ اور ایک کابینہ ہو گی۔
- "عرب سوشلسٹ جمہوریہ" کا دارالحکومت قاہرہ ہو گا۔
- مصر اور لیبیا کے ادغام کے بارے میں عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے دونوں ملکوں میں رائے شماری ہو گی۔

مڈل ایسٹ نیوز ایجنسی کے مطابق کرنل قذافی نے مصر اور لیبیا کے مذاکرات کی تمام تفصیلات سے شام کے صدر جنرل حافظ الاسد کو باخبر رکھا کیونکہ شام "عرب سوشلسٹ جمہوریہ" میں شامل ہو جائے گا۔ مصر اور لیبیا کے عوام نے ادغام کے فیصلے کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا ہے۔ قاہرہ کے اخبارات کے ادغام کے حق میں اداریے لکھے ہیں۔ اس لیے توقع ہے کہ عوام رائے شماری کے وقت ادغام کے حق میں ووٹ دیں گے۔

دو ممالک کا ادغام دنیائے عرب میں پہلا تجربہ ہے۔ اس سے پیشتر عرب ملکوں کے وفاق کے تجربے ہوئے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں مصر اور شام کے ایک وفاق کا تجربہ کیا گیا۔ اس وفاق کا نام "متحدہ عرب جمہوریہ" تھا۔ مصر کا موجودہ نام "متحدہ عرب جمہوریہ" اسی دور کی یادگار ہے۔ اس وفاق کا دارالحکومت بھی قاہرہ تھا اور کرنل جمال عبدالناصر اس کے صدر تھے کابینہ کے ارکان کی تعداد ۲۱ تھی۔ جن میں چودہ مصری اور سات شامی تھے۔ کچھ عرصے کے بعد یمن بھی اس وفاق میں شامل ہو گیا۔ یمن کی شرکت کے بعد ایک وفاقی کونسل قائم کی گئی جس کا صدر دفتر یمن کے شہر حدیدہ میں تھا۔ تقریباً تین سال کے بعد شام میں انقلاب آیا اور اس نے وفاق سے علیحدگی اختیار کر لی اس طرح یہ وفاق تین سال اور سات ماہ کے بعد ہی ختم ہو گیا

مشرقِ وسطیٰ میں دوسرا وفاق عراق اور اردن کا تھا جو ۱۹۵۱ء میں عمل میں لایا گیا۔ امورِ خارجہ، امورِ دفاع، کرنسی اور محصولات کے اختیارات وفاق کو سونپے گئے۔ لیکن یہ وفاق تین ماہ کے بعد ہی ٹوٹ گیا۔ اس تجربے میں فائدے کی بجائے سخت نقصان ہوا کیونکہ عراق اور اردن کے درمیان اختلافات اور کشیدگی مستقل ہو گئی۔

۱۷ اپریل ۱۹۷۱ء کو مصر لیبیا اور شام پر مشتمل "عرب جمہوریتوں کا وفاق" بنایا گیا۔ جس کی توثیق کے لیے یکم ستمبر ۱۹۷۱ء کو استصواب رائے کرایا گیا۔ تینوں ممالک کے عوام نے اس وفاق کی توثیق کر دی لیکن مشکل یہ تھی کہ وفاق میں شریک تمام ممالک کی اپنی خارجہ پالیسی تھی، مصر متوازن پالیسی کا حامی تھا لیبیا سوویٹ یونین کا سخت مخالف اور شام روس نواز تھا خارجہ پالیسی کا یہ اختلاف "عرب جمہوریتوں کے وفاق" کی کارکردگی میں بری طرح سے حائل تھا۔

مصر، لیبیا اور شام کے وفاق کے قیام کے وقت متفقہ طور پر اعلان کیا گیا تھا کہ اسرائیل کے ساتھ امن مذاکرات نہیں کیے جائیں گے اور عرب ممالک ایک انچ زمین سے بھی دستبردار نہیں ہوں گے۔ فلسطینی عوام کے حقوق کی سودے بازی نہیں ہونے دیں گے۔"

عوامی جمہوریہ چین اور سوویت یونین نے اس وفاق کا خیر مقدم کیا تھا۔ سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان "پراودا" نے لکھا کہ:

"یہ وفاق مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیلی توسیع پسندوں اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف ایک مضبوط متحدہ محاذ کا کام دے گا۔"

چینی کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان "پیکنگ ریویو" نے بھی اسے اسرائیل اور امریکی سامراج کے خلاف متحدہ محاذ کا نام دیا لیکن کچھ عرصے کے بعد مشرقِ وسطیٰ میں امریکی سامراج اور سوویت یونین سوشل سامراج کی سیاست نے نئی کروٹ لی۔ دونوں میں گٹھ جوڑ تو پہلے ہی سے تھا۔ اب وہ واضح ہونے لگا برزنیف ٹولہ اسرائیل سے دوستی اور تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ اور اپنے مفادات کے لیے عربوں کے مفادات کو قربان کرنے لگا۔ روسی اخبارات و رسائل نے عربوں کے خلاف پراپیگنڈا شروع کر دیا۔ مصری نوجوانوں میں جنگ کے حق میں بڑھتے ہوئے

رجحانات کی مخالفت کی جانے لگی۔ اپریل ۱۹۷۲ء میں "پراودا" کے نمائندہ خصوصی مقیم قاہرہ نے ان لیڈروں کی مذمت کی جو عوام کو جنگ کے لیے اکسا رہے تھے اور اسرائیل کے قبضے میں چلے جانے والے علاقوں کی واپسی کے لیے میدانِ کارزار میں کود جانے پر زور دے رہے تھے۔ روسی اخبار نویس نے ان نعروں کو "مہم جویانہ نعرے" قرار دیتے ہوئے الزام لگایا کہ "یہ مصری بورژوا طبقے کی سازش ہے جو امریکہ کے سیاسی مفاد پرستوں کے اشارے پر کی جا رہی ہے۔"

ایک طرف تو روسی اخبار نویس مصریوں کی مذمت کر رہے تھے دوسری جانب اسرائیل سے تعلقات خوشگوار بنانے کی راہ ہموار کر رہے تھے۔ کاشایوف نامی ایک روسی صحافی نے اپنی بیماری کے علاج کے بہانے اسرائیل کا دورہ کیا اور واپسی پر ہفت روزہ "نیو ٹائمز" میں پانچ صفحات پر مشتمل ایک مضمون تحریر کیا جس میں یہ تاثر دیا گیا کہ اسرائیل میں سوویت یونین سے بہتر تعلقات استوار کرنے کی تحریک پورے زور شور سے چل رہی ہے۔ اسرائیلی نوجوان اس تحریک کے حق میں ہیں۔ اسرائیلی اخبارات بھی اس تحریک کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس پالیسی سے سوویت یونین کا مقصد یہ تھا کہ عرب ممالک فلسطینی عوام کے حقوق کی سودے بازی کر لیں اپنے مقبوضہ علاقے اسرائیل کے پاس رہنے دیں اور اس طرح نام نہاد "پرامن بقائے باہمی" کی پالیسی پر کاربند ہو۔ برزنیف ٹولے کی اس پالیسی نے عربوں کو اپنی پالیسی پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور کیا۔

اسی دوران میں سوویت یونین نے بھارت سے فوجی معاہدہ کیا اور مشرقی پاکستان میں بھارتی مسلح جارحیت میں اعلانیہ شرکت کی۔ سوویت یونین کے اس اقدام نے عربوں کی آنکھیں کھول دیں۔ روس کے سوشل سامراجی منصوبے پوری عرب دنیا پر عیاں ہو گئے۔

۱۹۷۲ء کے اوائل میں چینی وزیر اعظم چو این لائی نے مسلم بلاک کی تشکیل پر زور دیا اور بتایا کہ مسلم دنیا، اپنی آزادی، اقتدارِ اعلیٰ اور خود مختاری کی حفاظت صرف مسلم ممالک کے اتحاد سے ہی کر سکتی ہے۔ ابھی مسلم بلاک کی تشکیل کا مسئلہ زیرِ غور ہی تھا کہ سوویت یونین نے مصر کو اسلحہ دینے سے انکار کر دیا۔ پھر لیبیا میں کرنل قذافی کی حکومت کے خلاف گڑبڑ کی خبر آئی۔ جس سے مسلم بلاک کے قیام کی راہ ہموار ہونے لگی۔ اس کی ابتدا، مصر سے روسی فوجی ماہرین کے اخراج سے ہوئی۔ اب مصر اور لیبیا کا ادغام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اس ادغام کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مصر کو اسرائیل سے مقبوضہ علاقے واپس لینے کے لیے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنا ہے۔ اسے اسلحہ کی سخت ضرورت ہے۔ روس نے اسلحہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ نہر سویز بند ہونے اور صحرائے سینا کے تیل پر اسرائیل کا قبضہ ہونے کی وجہ سے مصر اس حیثیت میں نہیں ہے کہ وہ بھاری مقدار میں اسلحہ خرید سکے۔ سعودی عرب اور کویت پر امریکی سامراج کا تسلط ہے۔ اب اس ادغام سے لیبیا کی دولت مصر کے کام آ سکے گی۔ اور مصر آسانی سے اسلحہ خرید سکے گا۔

مصر اور لیبیا کا ادغام عرب ممالک کے درمیان اتحاد کا ایک قدم ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ مشرقِ وسطیٰ پر امریکی سامراج اور سوویت سوشل سامراج کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے۔

عزمِ نو

سِل چکے ہیں گر لبِ فریاد تو کچھ غم نہیں
اب صدا اُن کو بزنگِ استعارا دیجیے

ان اندھیروں میں جلا کر مشعلِ عزم و یقیں
دیدۂ بے نور کو ذوقِ نظارا دیجیے

سونپئیے اہلِ ہنر کو کارِ تزئینِ چمن
شیخ صاحب کو عقائد کا غبارا دیجیے

کب تلک اغیار سے رکھو گے اُمیدِ کرم
اُٹھ کے اِس دیوارِ خستہ کو سہارا دیجیے

جس قدر بھی آپ کے دل میں متاعِ درد ہے
قوم کو مقبولؔ اس کا گوشوارا دیجیے

مقبول قریشی

ایجنٹ حضرات متوجہ ہوں

"الفتح" ایجنٹ حضرات کے تعاون کا از حد ممنون ہے۔ بعض کرمفرماؤں نے جریدے کی مقبولیت میں جہاں بھرپور تعاون کیا ہے وہاں بعض نے عدم تعاون کی حد کر دی ہے۔ ایک ایک سال سے زیادہ مدت کے واجبات ادا نہیں کیے اور یاددہانیوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ ادارہ اخبار فروش برادری کے احترام کے طور پر ان افراد اور اداروں کے نام شائع کرنے سے گریز کرتا رہا، اور خط و کتابت، رجسٹرڈ لیٹر اور دیگر ذرائع سے واجبات کی وصولی پر زور دیتا رہا۔ ادارہ ایک بار پھر نادہندگان کو اسی جذبۂ احترام کے تحت ۱۵ اگست ۷۲ء تک کا موقع دے رہا ہے کہ وہ واجبات ادا کر دیں۔ بصورت دیگر نہ صرف الفتح میں اداروں کے نام، واجبات کی رقم اور مدت سے متعلق کوائف شائع کیے جائیں گے بلکہ قانونی چارہ جوئی سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا ——— (ادارہ)

شرپسند کون ہیں؟

وہ قتل بھی کرتے ہیں تو.......

قطب الدّین احمد

پاکستان کی پچیس سالہ تاریخ میں تقریباً پندرہ سال سرمایہ دارانہ آمریت اور دس سال سرمایہ دارانہ جمہوریت کا دور رہا ہے۔ ہر دَور میں انتشار پسندوں اور ملک دشمن عناصر کی سرگرمیوں کے خلاف شور و ہنگامہ سننے میں آیا ہے۔ وزارتِ اطلاعات و نشریات کے ڈھول تاشے اور سرمایہ داروں کے پریس کے کاغذی گھوڑے بے پر کی اُڑاتے رہتے ہیں۔ آج بھی مولانا کوثر نیازی کے چرخے سے طرح طرح کی بے ہنگم آوازیں سنائی دیتی ہیں جس سے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مزدوروں اور کسانوں پر" جلاؤ گھیراؤ" کے الزام اور جھوٹے مکروہ پروپگنڈے کو تقویت ملتی ہے۔ سینماؤں میں وزارتِ اطلاعات و نشریات کی جاری کردہ پروپیگنڈہ کی ایسی ریلیں دکھائی جارہی ہیں جس پر مزدور رہنما تقریر کر رہے ہوتے ہیں۔ اور پس منظر سے کمنٹیٹر کی پُراسرار ہذیاتی چیخ سنائی دیتی ہے" انتشار پسندوں سے ہوشیار رہیئے" شیشے کے محلوں میں رہنے والا برسرِ اقتدار ٹولہ اور اس کے حواریوں کا مزدوروں اور کسانوں پر جھوٹ، بہتان اور الزام تراشی کے اس پتھراؤ میں آجکل بڑی شدت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ حقیقت کے آئینے میں ان کے پُرفریب چہرے دکھائے جائیں، تاکہ عوام حقیقی شرپسندوں کو پہچان سکیں۔

ہمارے ملک پر جاگیرداروں، اجارہ دار سرمایہ داروں نوکر شاہی، گماشتہ سرمایہ داروں اور سامراج سوشل سامراج کے حاشیہ برداروں کا قبضہ ہے۔ یہی لوگ کبھی سرمایہ دارانہ جمہوریت اور کبھی سرمایہ دارانہ آمریت کی شکل میں برسرِ اقتدار آتے رہے ہیں۔ مزدوروں کسانوں اور غریب عوام کے لوٹ کھسوٹ اور استحصال پر ان کا آپس میں گٹھ جوڑ ہے۔ لیکن وقتاً فوقتاً اس مالِ غنیمت کے بٹوارے پر ان کے مفادات کا تصادم بھی ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی الگ الگ جمہوری سیاسی پارٹیاں بنا رکھی ہیں۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی یہ سیاسی جماعتیں عوام کی توجہ ان کے بنیادی مسائل سے ہٹانے کے لیے طرح طرح کے گمراہ کن نعرے بلند کرتی رہی ہیں کبھی اسلام خطرے میں ہوتا ہے، تو کبھی نظریۂ پاکستان کے تحفظ کے لیے جنگ و جدل کرایا جاتا ہے کبھی اُردو کا جنازہ نکلتا ہے تو کبھی قومیت تہذیب اور ثقافت کا نعرہ بلند کر کے بیچارے عوام کو قربانی کا بکرا بنایا جاتا ہے۔ غریبوں اور مظلوموں کے اتحاد کو توڑنے کے لیے سازشیں اور ریشہ دوانیاں کی جاتی رہی ہیں۔ عوام میں نفرت اور عداوت کے بیج بوئے گئے ہیں۔ کچھ بھولے بھالے معصوم عوام ان کے مکر و فریب عیاری اور چرب زبانی کا شکار ہو جاتے ہیں جوش و جذبات کے طوفانی بہاؤ میں وہ بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ جب جوش کی فراوانی ہو تو عقل و خرد اور ہوش و حواس ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، دوست اور دشمن کی تمیز ناممکن ہو جاتی ہے اس طرح سامراجی پٹھو، جاگیردار اور سرمایہ دار عوام کو ٹکڑیوں اور گروہوں میں بانٹ کر ایک تیر سے دو شکار کھیلتے ہیں۔ نفاق اور نااتفاقی پیدا کر کے نہ صرف یہ کہ عوامی طاقت کو کمزور کرتے ہیں بلکہ اشتعال انگیز تحریروں اور تقریروں کے ذریعے نفرت و حقارت کی آگ کو ہوا دے کر غریبوں کی جھگیوں اور بستیوں کو خاکستر کر دیتے ہیں۔ طبقاتی بھائیوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیتے ہیں۔ آگ اور خون کے اس کھیل میں بیچارے عوام ہی کی شامت آتی ہے۔ قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کر کے یہ بورژوا سیاسی پارٹیاں پھر خود ہی ثالث بن جاتی ہیں۔ مذاکرات کیے جاتے ہیں، سودے بازی ہوتی ہے ریاکاری، مکاری اور اداکاری میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آخرکار" لین دین" کے بنیادی اصول پر کاربند یہ لوگ سمجھوتہ بھی کر لیتے ہیں۔

اس کی تازہ ترین مثال حالیہ اردو و سندھی تنازعہ ہے آج برسرِ اقتدار جاگیرداروں اور مخالف سرمایہ داروں کی کھلی جنگ ہے جھگڑا اس بات پر ہے کہ مزدوروں، کسانوں اور غریبوں کے استحصال میں کس کا کتنا حصہ ہو۔ لوٹ کھسوٹ کے حصے بخرے پر ناچاقی ہے۔ آمریت کے دَور میں سرمایہ داروں کو لوٹ مار کی کھلی اجازت اور قانونی تحفظ حاصل تھا۔ اس میں کسی حد تک کمی واقع ہو گئی ہے۔ ملک کے چاروں صوبے سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد کی حکومتوں پر جاگیرداروں نے پوری طرح قبضہ جما رکھا ہے۔ سرمایہ دار اس پر بری طرح پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ غم و غصہ اس بات کا ہے کہ عوامی استحصال میں ان کو مساوی حصہ نہیں مل رہا ہے۔ سرحد اور بلوچستان کی جاگیردارانہ حکومتیں کسانوں کی عوامی آزادی کی جدوجہد کے دباؤ سے پریشان ہیں۔ وہ اپنے اتحادی سرمایہ داروں سے مصالحت اور مفاہمت کی حامی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حال ہی میں سرمایہ داروں سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ سرحد اور بلوچستان میں اپنی سرمایہ کاری کو فروغ دیں۔ اور انہیں یہ یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ حکومت انہیں تمام استحصالی سہولتیں فراہم کرے گی۔ چیمبر آف کامرس کو دعوت نامے جاری کیے گئے جس میں اس بات کا اظہار کیا گیا کہ سرمایہ دار اور جاگیردار ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپس کا جھگڑا ان کے وجود کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ سرحد اور بلوچستان میں سرمایہ کاری، منافع خوری اسمگلنگ اور چور بازاری کی کھلی اجازت ہو گی۔ حکومت اور اس کے قوانین عوام دشمن سرگرمیوں میں ان کا تحفظ کرے گی۔ اس کے برعکس سندھ اور پنجاب کی حکومتیں مزدوروں کے شعوری ابھار اور سیاسی دباؤ کی وجہ سے سرمایہ داروں کو وہ ساری رعائتیں جو انہیں آمریت کے دَور میں حاصل تھیں فراہم کرنے سے مجبور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرحد اور بلوچستان کی برسرِ اقتدار سیاسی پارٹیاں اور دوسری حزبِ اختلاف کی جماعتیں سرمایہ داروں کی حمایتی ہیں۔ دوسری طرف سندھ اور پنجاب کا برسرِ اقتدار جاگیردار ٹولہ ہے۔ ان دو فریقوں کی رسہ کشی نے صوبہ سندھ کو میدانِ کارزار بنایا۔ منظم سازش تیار کی گئی اس کی تکمیل کے لیے لاکھوں روپیہ سرمایہ داروں نے فراہم کیا ہے پٹے ہوئے نعرے سے ہٹ کر اس بار ایک نیا نعرہ" اردو کا جنازہ ....." بلند کیا۔

غریب اور مظلوم عوام میں اپنے زر خرید غلاموں کے ذریعے منافرت پھیلائی گئی۔ کچھ معصوم اور بے گناہ لوگ اس سازش کو بھانپنے میں ناکام رہے اور ان کی عوام دشمن سرگرمیوں کے دام میں پھنس گئے۔ جوش و جذبات کی آگ بھڑک اٹھی۔ لوگ گمراہ کن نعروں، تحریروں اور تقریروں سے مشتعل ہوکر سڑکوں پر نکل آئے۔ تشدد، لبس جلاؤ، توڑ پھوڑ، لوٹ مار اور قتل و خون کے بھڑکتے ہوئے شعلوں نے پورے صوبہ سندھ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

افسر شاہی اور جاگیرداروں کی پروردہ پولیس حرکت میں آگئی۔ معصوم اور نہتے عوام کے سینوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ چنگیز اور ہلاکو کے دور کے مظالم دہرائے گئے غریب عوام کی بستیوں کی دیواریں خون کے چھینٹوں سے سُرخ ہوگئیں۔ سینکڑوں جھگیوں کے چراغ بجھ گئے۔ جھگڑا سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ہے لیکن اس سارے فساد اور ہنگامہ میں کسی جاگیردار اور سرمایہ دار کو کوئی خراش تک نہیں آئی بلکہ ان کے محلوں اور بنگلوں کی رونق اور بڑھ گئی ہے۔ مذاکرات ہوئے، سودے بازی ہوئی اور پھر مفاہمت اور مصالحت ہوگئی۔

سرمایہ دارانہ آمریت ہو یا جمہوریت دونوں ہی صورتوں میں چند مٹھی بھر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا اقتدار پر قبضہ ہوتا ہے۔ اس نظام میں ان کے بنائے ہوئے قوانین کا مقصد ان کے اپنے اور چند چنڈال چوکڑیوں کے مفادات کے تحفظ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

نوے فیصد عوام دیہاتوں کے غریب کسان، شہروں کے صنعتی مزدور اور کچلے ہوئے عوام کسمپرسی اور بے بسی کی زندگی گزارتے ہیں۔ انتہائی جانفشانی اور محنت کے باوجود وہ اپنے بنیادی حقوق "روٹی، کپڑا اور مکان" سے محروم ہیں کسان اناج اگاتے ہیں لیکن خود ان کے بیوی بچے بھوک اور افلاس کے شکار ہیں۔ مزدور کپڑا بناتے ہیں مگر ان کی ماں، بہنوں اور بیویوں کو پوری طرح تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا میسّر نہیں۔ کاریگر عالی شان محلات تعمیر کرتے ہیں لیکن خود سردی ہو یا گرمی، بارش ہو یا طوفان، کھلے آسمان کے نیچے ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ جاگیردار کسانوں کو بے دخل کرتے ہیں۔ ان کی جھونپڑیوں اور جھگیوں کو جلا دیتے ہیں۔ کاشتہ فصلوں کو تباہ کرتے ہیں، کھلیانوں کو آگ لگا دیتے ہیں کھیت مزدوروں کی بہو بیٹیوں کو اغوا کر لیتے ہیں۔ اس پر بھی بس نہیں چلتا تو اپنے پالتو غنڈوں اور پولیس کی مدد سے غریب کسانوں اور کھیت مزدوروں کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف سرمایہ دار ہزاروں کی تعداد میں مزدوروں کی چھانٹیاں کر رہے ہیں۔ ان کے جائز مطالبات اور حقوق کے جواب میں انہیں کھانے کو گولیاں پہننے کو کفن اور رہنے کو قبر دیئے جا رہے ہیں۔

ان حالات میں سوچ و فکر کی آزادی اور تحریر و تقریر کی آزادی کے کھوکھلے نعرے جو سرمایہ دارانہ پریس سے بلند کیے جاتے ہیں، ایسے تمام نعرے مظلوم طبقہ کے لیے بھوکے رہنے کی آزادی، مہلک بیماریوں کو پالنے کی آزادی اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی آزادی ثابت ہوئی ہیں۔

اب جبکہ مزدور اور کسان بیدار ہوا ہے اور استحصالی طبقوں کے گھیراؤ کے خلاف طبقاتی جدوجہد کر رہے ہیں تو جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوکر شاہی نے واویلا اور کہرام مچا رکھا ہے کہ مزدور اور کسان گھیراؤ جلاؤ کر رہے ہیں۔ حالانکہ واقعات یہ ثابت کرتے ہیں، تاریخ گواہ ہے کہ جمہوریت ہو یا آمریت، سرمایہ دارانہ نظام بذاتِ خود جلاؤ گھیراؤ، لوٹ مار اور قتل و غارت گری، دہشت اور غنڈہ گردی، لسانی فسادات اور دوسری اخلاق سوز ننگِ انسانیت اور عوام دشمن سرگرمیوں کا مجموعہ ہے ان تمام برائیوں کا اس نظام کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس گھناؤنے نظام کے رگ و ریشے، جسم و جان، قلب و دماغ اور دیگر سارے کل پرزے ظلم و استبداد، جبر و تشدد، استحصال اور لوٹ کھسوٹ پر قائم اور برقرار ہے۔

پیپلز پارٹی کی تنظیم۔ عوام اور کارکن کیا کہتے ہیں



موقع پرست

پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں

بشیر احمد عارف اسسٹنٹ سیکرٹری پیپلز پارٹی احاطہ حاجی موسٰی۔ لاہور

(۱) ——— پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہونے کے بعد کوئی مؤثر اقدام نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے سرمایہ دار، جاگیردار اور ابن الوقت پارٹی کی صفوں میں انتشار پھیلانے کی مذموم کوششیں کر رہے ہیں۔ اُن کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے جبکہ پرانے اور مخلص کارکنوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

(۲) ——— عوام نے پیپلز پارٹی سے جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں وہ کسی حد تک پوری ہو رہی ہیں۔

(۳) ——— برسرِ اقتدار آنے کے بعد پیپلز پارٹی کی قیادت کا کارکنوں سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ صوبہ پنجاب کی مثال لیجئے۔ سرمایہ دار، جاگیردار، ابن الوقت اور موقع پرست دھڑا دھڑ پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں ان عناصر کے ساتھ پارٹی کی قیادت کا رابطہ بھی ہے لیکن پارٹی کے پرانے، مخلص، بے لوث اور سرگرم کارکنوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

(۴) ——— سرکاری عہدوں پر جانے والے رہنماؤں کا کارکنوں کے ساتھ رویّہ بالکل بدل چکا ہے۔

(۵) ——— پارٹی کی تنظیم خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ ہمارے ذہن میں مندرجہ ذیل تجاویز ہیں:

(ا) پارٹی کے انتخابات جلد از جلد کرائے جائیں۔

(ب) سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور موقع پرست عناصر سے پارٹی کو پاک کیا جائے۔

(ج) انتخابات کے بعد پارٹی کے تمام نئے کھلنے والے متوازی دفاتر اور خانہ ساز تنظیموں کو فی الفور بند کیا جائے۔

(د) پارٹی کے مخلص، بے لوث اور دیرینہ کارکنوں کے اتحاد، نظم و ضبط اور پارٹی کے اعلیٰ عہدیداروں کا کارکنوں سے رابطہ اور حوصلہ افزائی تنظیم کو مستحکم اور پائیدار بنا سکتی ہے

(۶) ——— جو لوگ چور دروازوں سے پارٹی کی صفوں میں گھس گئے ہیں وہ مختلف ذرائع سے اپنا ذاتی مفاد حاصل کر رہے ہیں

(۷) ——— ہمارے خیال میں پارٹی کو حکومت پر بالادستی حاصل ہونی چاہیئے۔

(۸) ——— یہ تاثر جو نوکر شاہی اور افسر شاہی کی طرف سے دیا جا رہا ہے پارٹی اور پارٹی کے مخلص کارکنوں کے خلاف ایک سازش ہے۔





قارئین کہتے ہیں

سیّد محمد تقی نے

اعداد و شمار میں گھپلا کیا ہے

مجھے وہاب صدیقی صاحب سے اتفاق ہے کہ کسانوں کی زبان کو صوبائی زبان بنانا چاہیئے کیونکہ وہ اکثریت میں ہوتے ہیں۔ ترکیہ میں انقراضِ خلافت کے بعد نوجوان تُرکوں کے سامنے ایک اہم مسئلہ یہ بھی تھا کہ ترکی زبان کو کیسے از سرِ نو مرتّب کیا جائے۔ طویل بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ انگورا اور اُس کے نواح کے دیہات کی زبان کو اپنایا جائے۔ یہ تجربہ کامیاب رہا۔ آج وہی دیہاتی زبان ایک ترقی یافتہ علمی زبان بن چکی ہے۔

سیّد محمد تقی صاحب نے اعداد و شمار کے بارے میں گھپلا کیا ہے اور سوفسطائی استدلال سے کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سندھی شہروں کے رہنے والوں کی اکثریت اُردو بولتی ہے یا اُردو سمجھتی ہے لہٰذا سندھ میں اُن کی اکثریت ہے۔ یہاں اُردو زبان کے بولنے یا سمجھنے کا چکر نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کتنے سندھیوں کی مادری زبان سندھی ہے اور کتنے سندھیوں کی مادری زبان اُردو ہے۔ اُردو والے دانستہ سندھی نہیں سیکھتے۔ جب وہ کسی سندھی سے اُردو میں بات کریں گے تو مخاطب بامرِ مجبوری اُردو ہی میں جواب دے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اُردو والوں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔ یہ امر سندھیوں، پنجابیوں، بلوچوں اور پشتونوں کی رواداری اور وسعت قلب پر دلالت کرتا ہے کہ وہ شوق سے اُردو پڑھتے اور بولتے ہیں۔ اِس کے برعکس اردو والوں نے گزشتہ رُبع صدی میں کبھی سندھی پنجابی، پشتو یا بلوچی سیکھنے یا بولنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ وہ اُردو زبان اور اُردو ادب کے Ivory tower (برج عاج) سے باہر جھانکنا تک گوارا نہیں کرتے بلکہ اُلٹا علاقائی زبانوں اور ان کے ادب و شعر کی تضحیک کرتے ہیں۔ ان کی اسی برخود غلط ذہنیت، برتری اور تہذیب و تمدن کی اجارہ داری کے اِدعا نے اُردو زبان کی بے پناہ مقبولیت کو ناقابلِ بیان ٹھیس لگائی ہے۔ ان حضرات کا تعصب ناروا باقی رہا تو وہ دن دور نہیں جب سندھ کے علاوہ پنجاب، سرحدی صوبے اور بلوچستان میں بھی اُردو کے خلاف تحریکیں اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ جمنا پار کے ایک مہاجر نے ایک دن راقم سے کہا تھا "ہمیں ہندوستان واپس جانا منظور ہے لیکن ہم سندھی یا پنجابی ہرگز نہیں سیکھیں گے" یہی ظاہری دوستی کے پردے میں اُردو سے دشمنی کر رہے ہیں۔ اُردو کے جنگ باز حامیوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کے مالی مفادات اُردو کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اُردو کے نام پر ان لوگوں نے اخبارات و رسائل، یونیورسٹیوں، ریڈیو، ٹیلیویژن اور فلموں پر اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ انہیں اس بات کا اندیشہ ہے کہ علاقائی زبانوں اور علاقائی ادب و شعر کو فروغ ہوا تو ہماری چودھراہٹ ختم ہو جائے گی۔ یہی مفاد پروری ان میں اور سرمایہ داروں اور اسلام فروشوں میں قدرِ مشترک بن گئی ہے۔ نام اردو کا لیتے ہیں بات دُہی پیٹ کی ہے۔

حیات محمد خان۔ ۳۳ ہیڈن روڈ۔ لاہور

اچھی حکومت کرنا سب سے بڑا کمال ہے

نوائے وقت کی "ضمانت پر رہائی" کے باوجود مجھے امید ہے کہ میری ایک مخلصانہ تجویز ایک دوست وزیر تک پہنچا دی جائے گی۔ عالیجاہ —— بے شک، نہایت بیروزگاری کے عالم میں وزارت جیسی شئے کا مل جانا تندرستی سے بھی ہزار نعمت ہے۔ مگر اِس کو قائم اور محفوظ رکھنے کے لئے اخلاقی اور سیاسی قدروں کو پھلانگ کر سیاسی مستقبل کو تاریک کرنا کہاں کی دانش مندی ہے؟! یقین کیجئے حکومت کرنا یا حکومت حاصل کر لینا کوئی کمال نہیں اچھی حکومت کرنا سب سے بڑا کمال ہے۔ پچھلے دنوں آپ ملتان تشریف لائے تو آپ نے ریلوے اسٹیشن پر فرمایا۔ "شرپسندوں" کو کچل دیا جائے گا۔ آپ کو یاد ہو گا ایک دور تھا جب آپ جیسے لوگوں کو شرپسند کہا جاتا تھا۔ مگر جب سے آپ جیسے لوگوں کو "کھرپسند" بننے کا موقع ملا ہے آپ نے تنقید کرنے والوں کو شرپسند کہنا شروع کر دیا ہے۔ کیا ہماری پارٹی کا اصول نمبر دو "جمہوریت ہماری سیاست ہے" یہی درس دیتا ہے۔ لیکن ہم خوب سمجھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں "شرپسند" کیسے اور کیوں کہا جاتا ہے؟ ایک بے چارہ مگر با اصول شرپسند تو تھا۔ "مختار رانا" جس سے شیخ رشید سمیت آپ سب نے مصطفےٰ کھر کیخلاف سارے پنجاب میں تقریریں کرائیں۔ اِس "شرپسند" کا مطالبہ تھا کہ پارٹی کے اندر جمہوریت بحال کی جائے اور منشور پر عمل کیا جائے۔ مگر اُسے نہایت اہتمام کے ساتھ ٹھکانے لگا دیا گیا۔ ہم جانتے ہیں، ملتان میں بھی ایک "شرپسند" ہے۔ آپ کی نظر میں اور وہ دل یزداں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چند روز قبل بار رُوم میں "محمود بابر" پر حملہ کرایا گیا۔ جس شخص نے چند غنڈوں سمیت حملہ کیا۔ اُسے ملتان کا ہر شہری اچھی طرح جانتا ہے۔ پیپلز پارٹی کا یا کسی بھی سیاسی جماعت کا دیانت دار کارکن ذاتی دُشمنی میں کبھی نہیں جاتا۔ ایسے لوگ ہمارے ملک میں ہمیشہ حکومت کی سرپرستی سے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اگر اس انداز سے تنقید کرنے والوں کو راستے سے ہٹایا گیا تو اس سے نہ ملک و قوم کی خدمت ہو گی اور نہ ہی موجودہ حکومت کی خدمت ہو گی۔

(اسلم اعوان لودھراں)

بقیہ: ظاہری خبریں اندرونی کہانیاں

رہے تھے چند قدم کا فاصلہ تھا۔ غوری بار بار عاجزی سے کہتے "بیگم صاحب! آپ جنرل صاحب سے سفارش کر دیں ورنہ میری ایڈیٹری کا چانس نکل جائے گا" وہ خاتون گردن ہلا ہلا کر کہتیں "کہہ دوں گی، ضرور کہہ دوں گی۔ میں صبح کی فلائٹ سے پنڈی جا رہی ہوں جاتے ہی ظہیر علی سے تمہارے لیے بات کروں گی۔"

ہم نے سوچا نہ معلوم یہ خاتون کون ہیں، کوئی بڑی توپ لگتی تھیں۔ ہم اُلٹے پاؤں واپس آ گئے ذرا دیر بعد لفٹ سے نیچے پہنچے وہ خاتون ریسپشن پر کھڑی تھیں۔ غوری نبڈلوں کا پلندہ سنبھالے مؤدب کھڑے تھے۔ وہ باہر کے دروازے کی جانب چلیں تو یہ ان کی اردلی میں پیچھے پیچھے چلے۔ ایک کار باہر کھڑی تھی۔ انہوں نے کار کے اندر سامان رکھا۔ دروازہ کھول کر اندر خاتون کو بٹھایا۔ سر جھکا کر آہستہ سے کچھ کہا، غالباً سفارش کرنے کی یاد دہانی کراتے تھے۔

وہیں ہوٹل کے لاؤنج میں ایک دوست نے بتایا کہ وہ خاتون اقلیم اختر عرف جنرل رانی تھیں۔ غرضیکہ اس طرح جنرل رانی کی سفارش پر چور دروازے سے غوری "مارننگ نیوز" کے ایڈیٹر بنے۔ وہاں سے نکلے تو ڈان میں کالم نگار بنے۔ اب کالم نگاری کرتے ہیں۔ آزادیٔ صحافت کی بات کرتے ہیں۔ جمہوریت اور حق و انصاف کی بات کرتے ہیں۔ جنرل رانی گرفتار ہوتی ہیں تو ان کی بات نہیں کرتے سخت احسان ناشناسی ہے۔

بقیہ: معاہدہ شملہ

تنہا نمائندے نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ کئے ہوئے کسی سمجھوتے کی وقعت اُس وقت کیا ہوگی جب وہاں کی ترقی پسند قوتیں ہندوستان کے استحصال اور شری مجیب سے چھٹکارا حاصل کر لیں گی۔ لہٰذا اگر بات کرنی ہے تو شری مجیب سے کہا جائے کہ وہ مولانا بھاشانی اور ڈاکٹر طٰہٰ کو ساتھ لے کر ملیں تاکہ معانی خیز سمجھوتہ ہو سکے۔ تاکہ ہم اپنے عوام پر اور دنیا پر واضح کر سکیں کہ ہم مشرقی پاکستان کے اندرونی تضادات کو تسلیم کرتے ہیں اور موجودہ صورتِ حال میں شری مجیب الرحمان کی پٹھو حکومت کو وہاں کی جائز حکومت نہیں سمجھتے۔

کشمیر کا مسئلہ جوں کا توں ہے۔ دونوں حکومتیں اپنے اپنے موقف پر قائم ہیں۔ ہندوستان کا مؤقف بدلتا رہتا ہے۔ وہ کبھی تو آزاد کشمیر کو بھی اپنے ملک کا حصہ بتاتا ہے۔ لیکن گفت و شنید کے اندر بارہا اس نے یہ تجویز دی ہے کہ موجودہ جنگ بندی لائن کو عالمی سرحد تسلیم کر لیا جائے۔ پاکستان کا مؤقف کشمیر کے عوام کا حقِ خود اختیاری ہے۔

کشمیر کے متعلق معاہدے پر کافی اعتراضات کئے گئے ہیں پاکستانی حکومت معاہدے کا یہ مطلب نکالتی ہے کہ کیونکہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی بنیادی حیثیت تسلیم کی گئی ہے۔ لہٰذا یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ پاکستان نے اقوام متحدہ میں اِس مسئلے کو اٹھانے کا حق کھو دیا ہے۔ وہ جب چاہے اس مسئلے کو اقوام متحدہ میں اٹھا سکتا ہے۔ اندرا گاندھی کی حکومت اور پاکستان میں بہت سے معترضین یہ مطلب نکالتے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ صرف باہمی بات چیت سے طے ہو سکتا ہے۔ اقوام متحدہ میں نہیں اٹھایا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ۔

(۱) اقوام متحدہ کشمیر کے مسئلہ کو آئندہ ۲۵ سال میں بھی طے نہیں کرا سکتی اور اگر کسی وقت بھی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ تو پھر کوئی معاہدہ ہمیں کسی بھی عالمی مسئلہ کو اقوام متحدہ میں لے جانے سے نہیں روک سکتا۔

(۲) پُرامن باہمی بات چیت سے، یا باہمی جنگ سے کشمیر کا مسئلہ عارضی طور پر طے ہو سکتا ہے۔ مستقل طور پر نہیں۔

(۳) مستقل طور پر یہ مسئلہ صرف اِس صورت میں حل ہو سکتا ہے جب باہمی بات چیت میں یا باہمی جنگ میں کشمیر کے عوام کو شریک کیا جائے اور کشمیر کے دفاع کی داخلی یا خارجی طور پر ضمانت ہو۔

کشمیر کے عوام کے حق خود اختیاری سے پاکستان کی حکومت یہ مطلب لیتی رہی ہے کہ کشمیر کے عوام کو یہ حق دیا جائے گا کہ وہ پاکستان کے ساتھ شریک ہوں یا ہندوستان کے ساتھ۔ قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے میر غوث بخش بزنجو نے کہا کہ کشمیر کے عوام نے اپنی آزادی کے لئے کوئی خاص جدوجہد نہیں کی لہٰذا ہندوستان اور پاکستان کو باہمی اور پائیدار امن کی خاطر کشمیر میں جو بھی مناسب سمجھوتہ ہو کر لینا چاہیئے۔ ہم ہمہ شلسٹ ہر قسم کی بندر بانٹ کے خلاف ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اِس بندر بانٹ کے نتیجے میں پائیدار امن کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔ اگر کشمیر کے عوام نے اب تک کوئی کامیاب اور پُراثر جدوجہد نہیں کی تو اس کا یہ مطلب نہیں لینا چاہیئے کہ مستقبل میں بھی وہ اس بندر بانٹ کے خلاف کوئی کامیاب جدوجہد نہیں کریں گے۔ نہ ہی ہماری انصاف پسند قوم کو یہ زیب دیتا ہے کہ صرف اِس وجہ سے کہ مظلوم عوام میں اس قدر سکت نہیں کہ وہ اپنا حق چھین سکے۔ ہم مظلوم کو اِس کا حق دینے سے انکار کر دیں۔

بھارت کے ساتھ کوئی بھی معاہدہ کرتے ہوئے ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ بھارت اپنے اندرونی تضادات کی وجہ سے ایک توسیع پسند اور سامراجی مُلک ہے۔ اُس کی نیت اُس وقت تک صاف نہیں ہو سکتی جب تک یہ اندرونی تضادات حل نہیں ہو جاتے۔ اگر اس کی نیت صاف ہوتی تو وہ کبھی کا چین کے ساتھ اپنے تعلقات عالمی اصولوں کی بنیاد پر درست کر چکا ہوتا۔ اگر پاکستان کے ساتھ تاشقند اور شملہ میں دوستی کی بات چیت کی جا سکتی ہے تو ۱۹۶۲ء سے لے کر اب تک چین کے ساتھ اس قسم کی بات چیت کیوں نہیں کی گئی۔ اس لئے کہ چین کے ساتھ بہتر تعلقات افکار ماؤزے تنگ کے بھارت میں آنے کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔ اور افکارِ ماؤزے تنگ ہندوستان میں استحصالی طبقات کی شکست کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔

بقیہ: ۱۴ اِگست۔ عوامی دانشور

تحریک شروع ہوئی یہ عوام دشمن پارٹیاں راہ کی رکاوٹ بنیں اور محنت کش عوام کو سوشلسٹ، کافر اور ملحد کے خطابات سے نوازا گیا۔ پاکستان کے سیاسی اور اقتصادی بحران کی ذمہ دار یہی رجعت پسند سیاسی پارٹیاں ہیں۔ ان میں سے بعض سیاسی پارٹیوں نے اپنے مکروہ چہرے کو مذہبی لبادے میں چھپا رکھا ہے۔

جناب ظفر رضوی نے مزید کہا —— ۱۹۷۰ء کے پہلے عام انتخابات میں عوام میں زبردست سیاسی بیداری آ گئی۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں سوشلزم کو ووٹ دیا گیا۔ عوام کا خیال تھا کہ پیپلز پارٹی جیت گئی تو ان کے معاشی حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ معاشی مسائل کو سیاسی پارٹی کے ذریعے حل کرنے کی بیداری تھی یہ ایک صحت مند رجحان تھا۔ اس کے بعد ہی انقلاب کی راہیں کھلتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہماری بدقسمتی رہی ہے کہ ترقی پسندوں نے اپنی علیحدہ تشکل کو برقرار نہیں رکھا۔ وہ کبھی پاکستان آزاد پارٹی میں شامل ہوئے اور کبھی عوامی لیگ کی حمایت کرنے لگے لیکن جب نہر سویز کا بحران پیدا ہوا اور سہروردی مرحوم نے اس کے بارے میں اپنا مؤقف ظاہر کیا تو ترقی پسندوں کی آنکھیں کھلیں اور وہ عوامی لیگ سے علیحدہ ہو کر نیشنل عوامی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ یہ پارٹی بھی دو دھڑوں میں تقسیم ہونے کے بعد صوبائی سوچ سے باہر نہ جا سکی۔ اسی دوران پاکستان پیپلز پارٹی تیار ہوئی جس کی قیادت پر خالص جاگیرداروں کا قبضہ ہے۔ پیپلز پارٹی کا طبقاتی کردار سامنے آنے کے بعد یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی کہ ترقی پسندوں کو اپنا پلیٹ فارم بنانا ہوگا۔ بائیں بازو کی بورژوا سیاسی پارٹیوں کے ساتھ لگے پھرنے سے انقلاب تو دور کی بات رہی ہم اپنی منزل کی طرف ایک قدم بھی نہ بڑھ سکیں گے۔

ڈاکٹر طارق سہیل نے کہا کہ —— اِس ملک کے عوام کو ایک نظریاتی مملکت بنانے کا نعرہ دے کر دھوکہ دیا گیا، ان کی امنگوں کو کچلا گیا۔ جن لوگوں نے اقتدار پر قبضہ کیا وہ کبھی عوامی امنگوں پر پورا نہیں اترے انہوں نے گلے سڑے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو برقرار رکھنے کے لیے نوکر شاہی اور فوج سے اتحاد کر کے اپنا اقتدار قائم رکھا۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات تک جاگیرداروں، سرمایہ داروں، فوجی آمروں اور نوکر شاہی کا تسلط رہا۔ ان لٹیروں نے استحصال اور لوٹ کھسوٹ کی جو شرمناک مثال قائم کی وہ انسانی تاریخ کا ایک المناک حصہ ہے۔ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں مغربی پاکستان میں عوام نے روٹی کپڑے کے نام پر ووٹ دیا اور مشرقی پاکستان میں عوام نے صوبائی خود مختاری کے نعرے کو ووٹ دیا۔ فوجی آمریت سمجھتی تھی کہ صوبائی خود مختاری کے نام پر عوامی لیگ اتنی زبردست اکثریت میں نہیں آ لے گی۔ چنانچہ وہ فوجی جنتا سے اتحاد کرنے پر مجبور ہو گی۔

ادھر مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کامیاب ہوئی نعرہ سوشلزم کا تھا مگر ریاستی اقتدار پر وڈیرے قابض ہو گئے جو سوشلسٹ پروگرام کے بدترین دشمن ہیں۔ ایک بار مذہب اور نظریہ کے نام پر عوام کو دھوکہ دیا گیا۔ دوسری مرتبہ سوشلزم کے نام پر فریب دیا گیا۔

ڈاکٹر طارق سہیل نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے مزید کہا کہ —— صدر بھٹو کی نیت ہے کہ پاکستان کو کم از کم ایک فلاحی ریاست بنایا جائے۔ مگر وڈیروں اور فوجی جنتا کا اتحاد اس قدر مضبوط ہے کہ وہ پاکستان کو ایک فلاحی ریاست بنانے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ عوام میں تیزی سے شکوک شبہات ابھر رہے ہیں کہ یہ وڈیرے سوشلسٹ پروگرام کو ناکام بنا دیں گے۔

آس پاس

احمد ریاض

بھائی تم کس شہر کے ہو کس گاؤں سے اُٹھ کر آتے ہو
تازہ قتلِ عام میں تم نے کیا کھویا کیا پایا ہے
کیا کوئی دُکان مِلی ہے کوئی گھر منظور ہوا!
یا اب تک ویرانے میں تم پر اللہ کا سایا ہے

بٹیا میں دُکھیاری ماں ہوں اک عرضی تو لکھ دینا
میری بیٹی گاؤں کے دُشمن غنڈوں نے ہتھیالی ہے
میں تنہا گھر بار لٹا کر اِس پردیس میں پہنچی ہوں
میرے دُکھڑے کوئی نہ جانے میرا مولا والی ہے

ابا جان نے لے دیکر اک مِل منظور کرائی ہے!
ورنہ صاحب ہم دہلی میں چار مِلوں کے مالک تھے
اک راہی چلایا داتا تیرے کھیل نرالے ہیں
شاہ پھریں روٹی کو ترسیں، بھک منگے دھنوان ہوئے

حاکم صاحب کوئی رضائی کوئی بچھونا مِل جائے
میں اور میرے بیوی بچے شب کو ننگے سوتے ہیں
تم راجا ہو ہم پرجا ہیں، پرجائی فریاد سُنو!
یوں بھوکے یوں ننگے رہ کر کب دن پورے ہوتے ہیں

اس کو ہی کہتے ہیں صاحب جبرِ الٰہی قہرِ خدا
آج رئیسِ شہر ہیں کنگلے، دھن کے وارے نیارے ہیں
لوگ نئے ہیں، دیس نیا ہے کون کسی کو پہچانے!
صرف خوشامد کرنے والے دیس کے راج دُلارے ہیں

ایسے ہی لاکھوں افسانے میں سُن سُن کر لکھتا ہوں!
ایسے ہی خُونیں ہنگامے دیکھ کے آنسو ڈھلکے ہیں
نوعِ آدم، نسلِ حوّا کی تشہیرِ ذلّت سے
ٹیسوں نے انگڑائی لی، زخموں کے سینے چھلکے ہیں!

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi